اورنگ زیب

ایک نیا زاویۂ نظر

ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد

فیضان رشید (مترجم)

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

اورنگ زیب

ایک نیا زاویۂ نظر



ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد

فیضان رشید (مترجم)



خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

خدا بخش توسیعی لکچر ۱۹۸۶ء

تقسیم کار:

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ـــــ 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، دہلی ـــــ 110006

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی ـــــ 400003

مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ـــــ 202001

دوسرا اردو ایڈیشن ـــــ ۱۹۹۰ء

قیمت : پندرہ رُپے

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمٹیڈ) پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں طبع ہوئی

مصنف

نام :- ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد

پیدائش :- ۵ار دسمبر ۱۹۵۰ء (سیوان)

تعلیم :- ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی، پی ایچ۔ ڈی۔ (پٹنہ)

مشغلہ :- ۱۹۸۰ء سے پٹنہ یونیورسٹی کے ڈگری درجات سے متعلق شعبۂ تاریخ میں تعلیم و تدریس۔

خصوصی مضمون :- ٹاؤنس ان ارلی میڈیول کرناٹک (۶۰۰-۱۲۰۰ء)

مطبوعہ تصنیفات :- (۱) پراچین بھارتیہ سماج ایوم ارتھ شاستر۔ (۲) دلی سلطنت۔ (۳) ڈِکے اینڈ رِوائیول آف اربن سینٹرس ان میڈیول ساؤتھ انڈیا۔ (۴) پراچین بھارت۔ (۵) روس کا اتیہاس۔ (۶) "پٹنہ" ایک اتیہاسک ادھیین۔

مترجم

نام :- فیضان رشید (= رشید رضا بیگ)

پیدائش :- ۵ار دسمبر ۱۹۳۰ء

تعلیم :- ایم۔ اے، بی۔ ایس سی

مشغلہ :- اچھی کتابیں پڑھنا، اچھے بُرے ادیبوں کو پڑھنا۔

خصوصی مضمون :- آدمی کا مطالعہ،

مطبوعہ تصنیفات :- 'لارنس، معراج احمد، عابد رضا بیدار اور مسرت حسین آزاد'۔

وفات :- ۱۸ر اگست ۱۹۸۸ء

"ہندوستان کی تاریخ میں راون اور اورنگ زیب سے بڑا کمینہ اور کوئی نہ ملے گا۔" کچھ اس طرح کی تصویر کھینچی ہے ہمارے وِدّوانوں نے۔ اورنگ زیب فرشتہ نہیں تھا۔ باپ کو قیدی بنانے والا اور اپنے بھائیوں کا قاتل اور کچھ بھی ہو فرشتہ تو قطعاً نہیں تھا! اورنگ زیب ہندوستانی تاریخ کا شیطان تھا؟ ہندوستان کو کابل سے کاویری تک کی حدود بخشنے والا' اس کے ایک ایک انگ کو جوڑنے والا' اس کی رومانیت' اس کی تہذیب اور انسانی زندگی سے پیار کرنے والا اور جو کچھ ہو شیطان نہیں ہو سکتا۔

اشوک اور اکبر سے بھی وسیع تر ہندوستان کا نقشہ بنانے والا' اسی ملک میں اُگا ہوا' اور یہیں کی آب و ہوا میں بچپن' جوانی اور بڑھاپے کی منزلوں سے گزر کر اسی زمین کی مٹّی میں رُل مل جانے والا' یہ خالص ہندوستانی حکمران اتنا برا نہ ہوتا اگر اسے آج کے آئینہ میں دیکھنے کی مجبوری نہ ہوتی۔ آج کی یہ مجبوری محمد علی جناح اور اس ملک کی تقسیم ہے جو ایک ناسور کی طرح رستا رہتا ہے! آخر ہم کب تک تاریخ کو اس کے چوکھٹے سے ہٹا کر آج کی دُھول سے اَٹے ہوئے آئینہ میں دیکھتے رہیں گے؟ کب تک ہم اپنے من گھڑت افسانوں کو آنے والی نسلوں کے لیے تاریخ کی صورت میں پیش کر کے انسانوں کو جانوروں کی طرح آپس میں لڑاتے رہیں گے؟ یہ کتاب ان سوالوں کا جواب دینے کی ایک کوشش ہے۔

اوم پرکاش پرشاد

●●

عرضِ مترجم

تاریخ کے مظلوم اکابر کا مطالعہ جب گہرائی اور جذباتیت سے الگ ہو کر کیا جاتا ہے تو بے ساختہ انگریزی کا یہ مقولہ یاد آجاتا ہے۔ (مقولہ کچھ تصرّف کے ساتھ) :-

"MOST OF EVENTS ARE NOT TRUE IN HISTORY EXCEPT NAMES YEARS AND DATES, AND MOST EVENTS ARE TRUE IN STORIES EXCEPT NAMES YEARS AND DATES".

یعنی تاریخ میں بیشتر واقعات سچّے نہیں ہوتے ہیں سوائے ناموں، سالوں اور تاریخوں کے۔ جبکہ کہانی میں بیشتر واقعات درست ہوتے ہیں سوائے ناموں، سالوں اور تاریخوں کے۔

مذکورہ بالا مظلوم شاہوں کو تذکرہ نویسوں نے اپنی ذہنی ساخت قومی عصبیت یا ذاتی اور قومی مفادات کی روشنی میں پیش کیا۔ یا محض داستان سرائی کا شوق پورا کیا۔ اس کے بعد اُسی ذہنیت کے بعد میں آنے والے "دانشوروں" اور مورخین نے اپنے "پیشرو رہبران" کی باتوں کو کافی نمک مرچ لگا کر اپنی دوکانداری چمکائی۔ گویا "اپنے پہ اہل دہر کو قیاس کیا"۔ ایسے میں پھر ایک دوسرے انگریزی کے مقولہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ :

"WE SEE THINGS AS WE ARE, NOT AS THEY ARE"

یعنی "چیزیں ہمیں ویسی ہی نظر آتی ہیں۔ جیسے کہ ہم خود ہیں ــــ نہ کہ جیسی وہ بذات خود ہیں ــــ" اور ان "فنکار دانشوروں اور متعصب مورخوں کی" کارگیری" کی قیمت آنے والی نسلوں نے اپنے ذہنوں کو تنگ نظر بنا کے اور اپنے خون کو بہا کر ادا کی اور کر رہے ہیں ــــ اور نہ جانے کب تک ادا کرتے رہیں گے۔

لیکن شر کی تاریکی خواہ کتنی ہی مہیب کیوں نہ ہو اس کی یہ مجال نہیں کہ خیر کی حقیر ترین چنگاری کو دبا سکے۔ اور ایسا ہی ہوتا رہا کہ ایک طرف یہ ریاکار دانشور و مورخین زہر اور نفرت کی تخم ریزی کرتے رہے، تو دوسری طرف کچھ سعید روحیں حقائق کو سامنے لا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے انسانیت کی خدمت کرتی رہیں اور حتی الامکان نفرت کی دیواروں کو ڈھا کر محبت اور بھائی چارہ کے راستے ہموار کرتی رہیں۔

ان نیک طینت مورخین کے قافلہ میں ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد شعبہ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی بھی شامل ہو گئے ہیں۔

موصوف نے ہندوستانی تاریخ کی ایک مظلوم و بدنام شخصیت اورنگ زیب عالم گیر کو انتہائی دیدہ ریزی اور مستند حوالوں کی روشنی میں اپنی کتاب "اورنگ زیب۔ ایک نیا درشٹی کونڑ" میں پیش کرکے نہ صرف اورنگ زیب پر معروضی مطالعہ کیا ہے بلکہ موجودہ اور آنے والی نسلوں کی راستی کے رخ پر رہبری کی ہے۔

چونکہ یہ کتاب ہندی میں لکھی گئی ہے اس لیے اس کتاب سے صرف ہندی داں طبقہ ہی فیض اٹھا سکتا ہے. کتاب کی افادیت اور جس خلوصِ نیت سے اور نیک مقصد کے لیے لکھی گئی ان سب باتوں کا تقاضا تھا کہ اس کا ترجمہ ہندوستان کی سب زبانوں میں کیا جائے۔ فی الحال اس کا اردو ترجمہ اردو قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

مترجم: فیضان رشید

دو لفظ

ہندوستان کی تاریخ نویسی میں کچھ ایسی غلطیاں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے ہمیں کئی طرح کے اختلافات اور بے جا جانبداریاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثال کے طور پہ اگر موریہ سمراٹ اشوک کے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا جائے کہ :۔

(۱) اُس نے گدّی حاصل کرنے کیلئے اپنے سو (۱۰۰) بھائیوں کو جان سے مار دیا'

(۲) جنگِ کلنگ میں اُس نے ایک لاکھ لوگوں کو قتل کیا'

(۳) اس جنگ میں اس نے ڈیڑھ لاکھ لوگوں کو قید کیا'

(۴) وہ ایک کٹّر مذہبی حکمراں تھا کیونکہ اس نے بودھ دھرم کی تبلیغ اور توسیع کے لیے نہ کہ صرف اپنے رشتے داروں کو مقبوضہ علاقوں کے مختلف گوشوں میں بھیجا بلکہ اپنی حکومت کے افسران کو بھی اس کام میں لگا دیا اور مزید یہ کہ سرکاری خزانے کو استعمال کیا'

(۵) اس کی مذہبی پالیسی نے برہمنوں کو کافی دکھ پہنچایا'

تو کوئی بھی سادہ لوح قاری لازمی طور سے اس نتیجہ پہ پہنچے گا کہ اشوک ایک بُرا اور ظالم حکمراں تھا۔ اور ہندوستان کی تاریخ میں کوئی راجہ، شہنشاہ، سلطان یا بادشاہ ایسا نہیں ملتا کہ جس نے اشوک کی طرح اتنے بڑے پیمانہ پر قتل عام کیا ہو، دشمنوں کو قیدی بنایا ہو اور اپنے ذاتی مذہب کے لیے سرکاری خزانے کا استعمال کیا ہو۔

لیکن تاریخ میں اشوک کے بارے میں متعدد اچھے اور رفاہی کاموں کا تذکرہ تاریخی حوالوں سے کیا گیا ہے جس کی بنیاد پر ایک عظیم شہنشاہ ہمیں اس کو ماننا ہی پڑے گا۔

لیکن دو عظیم شخصیتوں یعنی محمد بن تغلق اور اورنگ زیب کے بارے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں سلطان اور بادشاہ کے کافی اہم کاموں کو نظر انداز کرتے ہوئے تاریخ کی کتابوں میں انھیں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ سلطان (محمد بن تغلق) ایک پاگل حکمراں اور بادشاہ (اورنگ زیب) ایک کٹّر اور ظالم سلطان کے روپ میں شناخت کئے جانے لگے۔ جبکہ ان دونوں حکمرانوں کے عہد میں نہ تو اشوک کی طرح قتل عام ہوا نہ لاتعداد دشمن قیدی بنائے گئے، نا ہی مذہبی تبلیغ کے لیے سرکاری خزانہ' حکومت کی طاقت اور رشتہ داروں کا استعمال کیا گیا محض اپنے ذاتی مذہب کو توسیع دینے کی خاطر۔ !

مذکورہ بالا عناصر کو ذہن میں رکھتے ہوئے عالم مورخوں کے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ وہ جب محمد بن تغلق اور تاریخ

اورنگ زیب کے بارے میں لکھیں تو یہ حقیقت مدِّ نظر رہنا چاہیے کہ وہ سمراٹ اشوک کی طرح صرف برے ہی نہ تھا بلکہ اچھے کاموں کے لیے بھی پہچانا جائے۔ اورنگ زیب دوسرے حکمرانوں کی طرح پہلے ایک بادشاہ تھا، پھر کسی مذہب کو ماننے والا۔ کامیاب حکمرانی کے لیے اس نے مختلف تجربات کیے جن کے اچھے اور برے اثرات ہندو اور مسلمان دونوں پر پڑے۔

اورنگ زیب کے خلاف سب سے زیادہ متعصبانہ رویّہ انگریزی عہد کے مورخوں نے اپنایا۔ ایلیٹ اور ڈاؤسن[1,2] نامی دو انگریز مورخوں نے اپنی کتابوں میں مسلم سیاحوں کے سفرناموں اور مسلم مورخوں کی لکھی ہوئی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اپنے ترجمے میں ان مورخوں نے خاص طور سے اس بات کا دھیان رکھا کہ وہی باتیں انگریزی میں ترجمہ کی جائیں جن سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان معاشرتی، معاشی، سیاسی اور خاص طور سے مذہبی زاویہ نظر سے اختلاف پیدا ہوں، ان دونوں کے درمیان بھید بھاؤ بڑھتا رہے۔ انگریزوں نے اپنی عقل کے بل پر دنیا کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کیا اور ہمیشہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر یقین کیا۔ انگریزوں کی اس پالیسی کا ایلیٹ اور ڈاؤسن کی تحریروں پر کافی گہرا اثر پڑا۔ دوسرے مسلم حکمرانوں کی بات اگر یہاں نہ بھی کریں اور صرف اورنگ زیب پر دھیان دیں تو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اُسے مغلیہ عہد کا سب سے خراب بادشاہ ثابت کرنے کے لیے انھوں نے صرف اورنگ زیب کے اچھے کاموں کو کوئی مقام نہیں دیا بلکہ اس کی شخصیت میں داغ لگانے کے لیے غلط اور جھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر تاریخ کے ساتھ سخت ناانصافی کی۔

دوسری کتاب مشہور تاریخ داں جادو سرکار[3] (سر جادو ناتھ سرکار) کی لکھی ہوئی ہندی اور انگریزی زبانوں میں موجود ہیں۔ ویسے "سر" کا خطاب انگریزوں نے زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کو دیا جنھوں نے انگریزوں کے خیالات و بہبودی کا خیر مقدم دل کھول کر کیا۔ جادو ناتھ سرکار کی کتاب پڑھنے پر ہمیں بڑی دلچسپ باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ سرکار صاحب کوئی ایسا قدم اٹھانے سے باز نہیں آتے ہیں محض یہ ثابت کرنے کیلئے کہ اورنگ زیب مغلیہ عہد کا بدترین بادشاہ تھا۔ جبکہ ہمیں اُن ہی کی کتاب میں اورنگ زیب سے متعلق کافی اہم باتیں ایسی بھی دیکھنے کو ملتی ہیں جن پر غور کرنے سے ہم آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ وہ اتنا کٹّر، ظالم اور متعصب نہیں تھا کہ جتنا بتایا گیا ہے۔ اِس حقیقت کو سمجھنے کیلئے اگر ہم سرکار صاحب کی کتاب میں شائع اورنگ زیب کے "فرمانوں" کا مطالعہ کریں تو بات کافی حد تک سمجھ میں آسکتی ہے۔

آشیروادی لال[4]، ایشوری پرشاد[5]، شری رام شرما[6]، آر۔ سی مجمدار[7] اور وی۔ ایس۔ اسمتھ[8] وغیرہ جیسے مورّخوں نے بھی وسطی عہد پر کچھ کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن اورنگ زیب پر لکھتے وقت ان مورخوں نے بھی اپنے "جانبدارانہ رویہ" کا اظہار جانے یا انجانے میں کچھ اس انداز سے کیا کہ پڑھنے والے نے اُسے ایک کٹّر مسلمان اور ظالم بادشاہ ہی سمجھا۔

لیکن ۱۹۶۰ء کے آس پاس ہمیں کچھ ایسے غیر جانبدار اور صاف ذہن مورخوں کی لکھی ہوئی تحریریں اور کتابیں ملتی ہیں جن میں اورنگ زیب کے بارے میں کافی غیر جانبدارانہ باتوں کا علم ہوتا ہے۔ جن میں عرفان حبیب[9]، ایس نورالحسن[10]، ہربنس مکھیا[11]، اطہر علی[12] اور ستیش چندر[13] وغیرہ کے نام کافی اہم ہیں۔ عرفان حبیب نے اپنی کتاب اور دوسری سلجھی ہوئی تحریروں کے ذریعہ کچھ ایسے نکات اجاگر کیے ہیں جن کی بنیاد پر صاف ذہن لوگوں کی نہ صرف ہمدردیاں اورنگ زیب کے ساتھ ہوئیں بلکہ جادو ناتھ سرکار اور دوسرے مورخین کی تحریروں کی کمزوریاں[14] بھی ابھر کے سامنے آنے لگیں

ہربنس مکھیا[15] اپنی سلجھی ہوئی بے لاگ تحریر میں بتاتے ہیں کہ آر۔ سی مجمدار اورنگ زیب کے ذریعہ توڑے ہوئے مندروں کا تذکرہ تو بڑے زور و شور سے کرتے ہیں لیکن اُن حقائق پر چپ سادھ لیتے ہیں کہ اُسی بادشاہ نے برہمنوں اور مندروں کو دان دیا جنکی مختصر تفصیل ڈاکٹر کے۔ کے دت کے ذریعہ لکھی گئی "سم فرمانس، سندس اینڈ پروانز" نامی تحریر میں پائی جاتی ہے۔ مکھیا صاحب کا یہ عقیدہ ہے کہ حکمرانوں کے ذریعہ توڑے گئے مندروں کے تذکرہ کو تاریخ میں مقام ضرور دیا جائے لیکن صرف مسلمانوں ہی کے بارے میں نہ لکھا جائے بلکہ ان ہندو حکمرانوں کے بارے میں بھی لکھا جائے جنھوں نے ہندو مندروں کو برباد کیا۔ ان کا خیال ہے کہ اصل اور قابلِ تعریف وہی مورخ ہے جو کہ قدیم زمانے کے تذکرات میں ایک منصف مزاج جج کی طرح راست باز و غیر جانبدار رہے۔

ایک طرف سر جادو ناتھ سرکار اور انگریز مورخین بالخصوص ایلیٹ، ڈاوسن اور وی اے۔ اسمتھ تاریخ کے معنی راجہ رانی، وزیر، درباری، اُمرا، ناچنے گانے والیاں اور راج دربار سے متعلق "تبرکات" سے لیتے ہیں۔ وہاں عرفان حبیب نے تاریخ کا مطلب تکنیکی ترقی، زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت میں تاریخی تبدیلیوں کو خصوصی بنیاد بتایا ہے۔ انھیں بنیادوں کے بل پر عرفان حبیب نے اورنگ زیبی عہد کی خصوصیات کا اگلے اور پچھلے حکمرانوں کے ادوار سے مقابلہ کرتے ہوئے اورنگ زیب کی خوبیوں کو ثبوت کے ساتھ اُجاگر کیا ہے۔

اطہر علی نے ہندوؤں کے سب سے بڑے حمایتی کہلائے جانے والے بادشاہ اکبر اور ہندوؤں کے سب سے بڑے مبینہ دشمن اورنگ زیب کے عہدوں کے عہدیدارانِ حکومت کی تفصیلات کی تحقیق دستیاب شہادتوں کی بنا پر کی ہے اور یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہے ہیں کہ اکبر نے اپنے دورانِ حکومت میں سب سے زیادہ ہندوؤں کو نہیں نوازا ہے۔ اس نے حکومتی عہدوں پر اتنی تعداد میں ہندوؤں کا تقرر نہیں کیا جتنی تعداد میں اورنگ زیب نے اپنے دورِ حکومت میں کیے۔

ایک تیسرے رخ کو اجاگر کرنے کا سہرا ستیش چندر کے سر جاتا ہے جنھوں نے جزیہ ٹیکس پر ایک غیر جانبدارانہ و سلجھی ہوئی تحریر شائع کی ہے۔ اپنی کتاب میں سب سے پہلے بہت سلیقہ اور ٹھوس ڈھنگ پر انھوں نے اورنگ زیب

کا مطالعہ کیا ہے اور اس کی کمزوریاں اور خوبیاں بہت سلجھے ہوئے اور متوازن انداز میں پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

رومیلا تھاپر نے اپنی کتاب "مدھیہ کالین بھارت" میں انتہائی واضح اور ٹھوس الفاظ میں سلطنت مغلیہ کے زوال کا باعث بجائے اورنگ زیب کے اس زمانے کے سماجی واقتصادی حالات اور اورنگ زیب کے جانشینوں کو مانا ہے۔

بپن چندر نے اپنی کتاب "مدھیہ کالین بھارت" کے پہلے باب میں مغلیہ سلطنت کے زوال کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ دنیا میں کسی عہد کے عروج و زوال کی ذمہ داری ایک فرد پر ڈالنا اسی حالت میں صحیح ہوگا جبکہ تاریخ کو ہم راجہ رانی کی کہانی مان لیں۔

بی۔ این پانڈے نے بھی خدا بخش خطبات میں اس بات پر کافی زور دیا ہے کہ اب اورنگ زیب کے بارے میں ان حقائق کو بھی روشنی میں لانا چاہئے جنھیں اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔

اورنگ زیب کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں ڈاکٹر بیدار صاحب ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے خاص حصّہ لیا۔ اور اپنا بیش قیمت وقت اصلی مسوّدہ کو پڑھنے میں دیا۔ ان کے قیمتی مشوروں نے مجھے اس مشکل کام کی تکمیل میں کافی ہمّت افزائی کی۔ ورنہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ اس کے علاوہ میں ڈاکٹر شمشاد حسین، ڈاکٹر جناردن پرشاد سنگھ، ڈاکٹر سمنت نیوگی اور دوسرے بزرگوں کا بیحد شکر گزار ہوں جنھوں نے پہلی دسمبر ۱۹۸۶ء کو خدا بخش لائبریری میں میرا اورنگ زیب کے بارے میں خطبہ سماعت فرما کے میری ہمت بڑھائی۔ پٹنہ کالج اور دوسرے کالجوں سے آئے ہوئے بیدار ذہن اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے طلبا کا میں دل سے مشکور ہوں جنھوں نے ۹ دسمبر ۱۹۸۶ء کو خدا بخش لائبریری میں میرے اورنگ زیب کے بارے میں مقالہ کو انتہائی نظم و ضبط اور دلچسپی کے ساتھ سنا۔ ان طلبا کی تعداد تین چار سو کے قریب تھی۔

اس لکچر کے ہندی میں دو اڈیشن (۱۹۸۷ اور ۱۹۸۹) شائع ہو چکے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ لائبریری اس کا اردو اڈیشن نکال رہی ہے۔

ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد
شعبہ تاریخ، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

باب-۱

حالاتِ زندگی

شاہجہاں اور ممتاز محل کی ساتویں اولاد ــــــــ نائب حاکم (صوبہ دار وغیرہ) کی حیثیت سے دس سال اور حکمراں کی حیثیت سے پچاس سال تک حکومت کرنے والا ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب عالم گیر (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) جسے جادو ناتھ سرکار[20] نے شعور، کردار اور حوصلہ میں ایشیا کے سب سے بڑے حکمرانوں میں مانا ہے، جس کی پیدائش گجرات کے شہر دوحد[21] میں ۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء (ذیقعدہ ۱۵ سن ہجری ۱۰۲۷) کو ہوئی۔

اورنگ زیب کو قرآن کا پورا علم حاصل تھا۔ عربی اور فارسی زبانوں کا بھی عالم تھا۔ اس کے گھرانے میں ہندی زبان کا استعمال ہوتا ہے بے شمار مقبول عام ہندی کہاوتیں اورنگ زیب کو یاد تھیں اور دوران گفتگو ان کا وہ استعمال بھی کرتا تھا۔ غیر حقیقی مبالغہ آمیز اور خوشامدانہ ادبیات سے اُسے نفرت تھی۔ چینی مٹی کے برتن، کروندہ اور سُپاری اسے بہت پسند تھے۔ خزانہ کا استعمال تعمیرات پر کرنا اس نے پسند نہیں کیا۔ رفاہِ عام کی خاطر اس نے بہت سی سرائیں بنوائیں۔ چودہ سال کی عمر میں ہاتھیوں کی لڑائی کے سلسلہ میں وہ ایک ہاتھی پر اُس وقت حملہ آور ہو گیا، جبکہ تمام شہزادے وہاں سے ڈر کر بھاگ گئے تھے اور جب اس کے والد شاہجہاں نے اس کی ہمت اور بہادری کے لیے پیار بھرے لہجہ میں ڈانٹا تو نوعمر اورنگ زیب نے کہا "لڑائی میں اگر میں مارا جاتا تو ڈر کر بھاگ جانے سے تو اچھا ہی تھا۔" ۱۳ دسمبر ۱۶۳۴ء کو اورنگ زیب نے دس ہزاری (دس ہزار گھڑ سوار فوج کی کمان) کا شاہی منصب حاصل کیا۔

اورنگ زیب کی چار بیویاں دلرس بانو، رحمت النسا، اورنگ آبادی اور اُدے پوری تھیں۔ اورنگ زیب ہیرا بائی (زین آبادی) کی شوخی، رعنائی، موسیقی اور خوبصورتی سے متاثر تھا۔ اس کی اس محبوبہ کی وفات جوان العمری میں ہو گئی تھی۔ غالباً اپنی محبوبہ کی موت کے غم کو وہ تمام زندگی نہیں بھلا سکا

گجرات کی صوبہ داری دو سال کرنے کے بعد اورنگ زیب ۲۱ جنوری ۱۶۴۷ء کو بلخ اور بدخشاں کا صوبہ دار اور سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ اُس صوبہ کا سلطان نذر محمد خاں ایک نااہل اور کمزور حکمراں تھا۔ اس حکمراں کو زیر کرنے کے لیے شاہجہاں نے فوجیں بھیجیں۔ جب کامیابی نہیں ملی تو اورنگ زیب کو بھیجا گیا۔ کافی استقلال، مضبوطی اور نظم و ضبط کے ساتھ طاقتور دشمن کا اورنگ زیب مقابلہ کرتا رہا۔ نماز کا وقت ہوتے پر میدان جنگ میں ہی چادر بچھا کر وہ جب نماز پڑھنے لگا تو مخالف کی فوج یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ وہاں کا طاقتور حکمراں عبدالعزیز چلّا اٹھا۔ "لڑائی بند کر دو۔ ایسے آدمی سے لڑنا اپنی ہی تباہی کو

دعوت دینا ہے۔"[۲۳]

بلخ کی اس چڑھائی کے بعد اورنگ زیب ۱۶۴۸ء سے ۱۶۵۲ء تک ملتان اور سندھ کا صوبہ دار رہا۔

اپنی جغرافیائی حیثیت اور اقتصادی اہمیت کی وجہ سے مغربی سمت سے آنے والے راستہ کے باب خاص پر واقع ہوتے اور جنوب سے کابل کو جانے والی راہ کو روکنے والا قندھار ہندوستان اور فارس کے حکمرانوں کے درمیان کشمکش کا ایک خاص سبب بن گیا تھا۔ اُس پر قابض ہونے کے لیے پہلا محاصرہ ۱۴ مئی ۱۶۴۹ء کو اورنگ زیب اور وزیر سعد اللہ خاں کی کمان میں پچاس ہزار فوجیوں نے کیا لیکن کامیابی نہیں ملی۔ دوسرا محاصرہ ۲ مئی ۱۶۵۲ء کو اورنگ زیب اور سعد اللہ خاں کی کمان میں پھر کیا گیا لیکن دوبارہ ناکامی ہوئی۔ شاہجہاں نے اورنگ زیب کو بہت ڈانٹا اور نااہلی کی اس الزام تراشی کا نتیجہ بادشاہ کو اگلے ہی سال مل گیا جب پہلے سے بھی زیادہ دولت خرچ کرکے اور کافی تیاری کے باوجود قندھار کے حملہ میں بری طرح ہار کھا کر دارا شکوہ کو واپس ہونا پڑا۔[۲۴]

قندھار سے اورنگ زیب کابل لوٹا اور ۱۶۵۲ء میں دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا اس سے پہلے جب ۱۶۴۴ء میں اس نے دکن کی صوبہ داری چھوڑی تھی تب سے وہاں امور سلطنت میں اصلاح اور ترقی نہیں ہو سکی تھی۔[۲۵] اس مرتبہ دکن کی صوبہ داری سنبھالتے ہی اس نے زمین کا بندوبست کیا۔ اس کے وضع کیے ہوئے مالگذاری ضابطہ کو تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔[۲۶] بوڑھے اور نااہل افسران کو ہٹا کر بھروسہ مند اور باصلاحیت افراد کا دکن میں اُس نے تقرر کیا۔ اس کے ذریعہ کیے گئے قابلِ تعریف بندوبست سے تقریباً پچاس ہزار سالانہ کی بچت ہوئی۔[۲۷]

اورنگ زیب نے ۱۶۵۶ء میں گولکنڈہ، ۱۶۵۷ء میں بیجاپور وغیرہ علاقوں پر کامیاب حملے کیے۔

شاہجہاں اپنا جانشین دارا شکوہ کو بنانا چاہتا تھا اور اس مقصد میں سب سے بڑی رکاوٹ اورنگ زیب کو سمجھتا تھا، اس لیے اورنگ زیب کو کسی نہ کسی مسئلہ کو سلجھانے کے بہانے دربار سے دور ہی رکھتا۔ ادھر طرح طرح کے مسائل سے ٹکرانے کے نتیجہ میں اورنگ زیب کی صلاحیتوں میں تیزی سے نکھار آتا گیا۔ دارا کو سلطنت کا جانشین بنانے اور انتظام سلطنت سے پوری طرح آگاہ کرنے کے لیے شاہجہاں اُسے کئی سال سے اپنے پاس ہی رکھتا رہا۔ دارا شکوہ کو اس قدر اختیار حاصل تھا کہ وہ ایک بادشاہ سے کم نہیں تھا۔ شاہجہاں سے ملنے کے لیے کسی کو بھی دارا سے اجازت لینا لازمی تھا۔ باپ کے اس پیار کے سبب دارا شکوہ امور جنگ و حکومت کا تجربہ حاصل نہیں کر سکا۔ صحیح آدمی کی پہچان کی اہلیت کا فقدان دارا شکوہ میں پایا جانا فطری تھا۔ افواج سے اس کا کوئی ربط نہیں تھا۔

۶ ستمبر ۱۶۵۷ء کو شاہجہاں دہلی میں بیمار پڑا اور ۲۶ اکتوبر کو اُسے آگرہ لایا گیا، اپنے باپ کے نام پر دارا انتظام حکومت

چلتا رہا۔ اس دوران اورنگ زیب کے معتمد ساتھی میر جملہ کو اس نے وزیر کے عہدہ سے ہٹا دیا۔ دارا کے اس رویہ سے اورنگ زیب کے علاوہ باقی دونوں بھائیوں کو بھی گدی کے سلسلہ میں فکر ہونے لگی۔ اسی دوران یہ خبر ملی کہ دارا سے چھوٹا بھائی شجاع اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر کے بنگال سے دہلی کی سمت بڑھا آرہا ہے۔ شاہجہاں کی اجازت سے بائیس ہزار فوجی شجاع کو شکست دینے کے لیے بھیجے گئے۔ پھر شاہجہاں کو خبر ملی کہ اس کے بیٹے شہزادہ مراد نے گجرات میں خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اورنگ زیب سے مل گیا ہے۔ چنانچہ گجرات سے مراد اور دکن سے اورنگ زیب کے حملوں کو روکنے کے لیے دارا نے مضبوط فوجی بندوبست کیا۔

مندرجہ بالا واقعات سے شاہجہاں کا مکمل جانبدارانہ رویہ جھلکتا ہے جو ایک باپ اور بادشاہ کے لیے مناسب نہیں تھا۔ شاہجہاں کی دارا کے لیے جانبداری کو ہم بادشاہ کا حق مانیں تو ہمیں اس کے انجام کے بارے میں بھی احتیاط اور غیر جانبداری سے غور کرنا ہوگا۔ اُس وقت تک راج گدی سے متعلق پیدا شدہ مسائل کی جانچ یا سب لڑکوں کو سمجھانے کے بجائے دارا کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنا شاہجہاں ہی نہیں بلکہ اس صورت میں کسی بھی بادشاہ کے لئے خود کوئی مسئلہ کھڑا کرنے کا باعث ہو سکتا تھا۔ باوجود اس کے ہمیں اورنگ زیب کے تحمّل کا علم ہوتا ہے۔ مراد یا شجاع سے پہلے اورنگ زیب نے بغاوت نہیں کی۔ شاہجہاں کو ایک بادشاہ ہونے کے ناطے، اُسے ایک بیٹے سے زیادہ گدی کی مضبوطی پر دھیان دینا چاہیے تھا۔ گدی کی حالت ٹھیک رہتی تو کمزور اور نااہل بیٹا بھی کچھ دنوں تک موج کر ہی سکتا تھا اور گدی کے استحکام کے لیے مخالفین کی تعداد میں کمی لازمی تھی۔ مخالفین کی تعداد کو کم کرنے کے لیے ایک ایسے ماحول کی ضرورت تھی جس میں دارا اس قابل ہوتا کہ اپنے باقی سب بھائیوں پر اقتدار پالیتا۔ اگر یہ ممکن نہیں تھا تو شاہجہاں ایسا ماحول بناتا کہ دارا کے گدی نشین ہونے کے لیے اس کے باقی بیٹے خود رضامندی دے دیتے۔ لیکن مندرجہ بالا ساری باتیں کبھی نہیں ہو پائیں کیوں کہ شاہجہاں نے دارا کی طرفداری کا قدم ابتدا سے ہی اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اورنگ زیب کی بہترین صلاحیتوں سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود وہ نہ تو دارا کو زیادہ باصلاحیت بنانے کے لیے کوشاں ہوا اور نہ ہی اورنگ زیب کو اپنے ساتھ شامل کرنے کی جستجو کی۔ اس نے مراد کو خط لکھا تھا کہ اگر وہ اورنگ زیب کو قتل کر دے تو اُسے ہی بادشاہ بنا دیا جائے گا۔"[۲۶] مراد کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے جو شرط شاہجہاں نے رکھی وہ پوری ہوئی یا نہیں لیکن اتنا طے ہو جاتا ہے کہ شاہجہاں اورنگ زیب کا جانی دشمن ہو گیا تھا۔ اس چال کے سہارے بھی اگر شاہجہاں مراد اور شجاع کو اپنی طرف ملانے کی صلاحیت رکھتا تو شاید اورنگ زیب کی صلاحیت کو چیلنج کیا جا سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ دارا کے علاوہ باقی بیٹوں نے باپ اور دشمن میں کوئی فرق نہیں سمجھا۔

ہندوستانی تہذیب کے تناظر میں باپ کو قید کرنا اور بڑے بھائی کا قتل ظلم کا مظہر ہو سکتا ہے اور بڑی حد تک تاریخ

بھی اس فعل کو اچھا نہیں مان سکتی، لیکن ایسا تسلیم کر لینا اس صورت میں جانبداری پر مبنی ہوگا جب ہم پہلے کے واقعات پر غور کیے بغیر صرف اورنگ زیب کو قصوروار قرار دیں۔ اپنے باپ کو مار کر مگدھ کے راجہ اجات شترو اور ۹۹ بھائیوں کو مار کر گدی حاصل کرنے والے موریہ شہنشاہ اشوک جیسے متعدد حکمراں ہمیں تاریخ کے صفحات میں مل جائیں گے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنی ذات سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔!

اورنگ زیب نے بچپن سے ہی جس بہادری کا مظاہرہ کیا اس پر کسی بھی باپ کو ناز ہونا چاہیئے تھا۔ عیش و آرام اور کورچشمی سے دور رہ کر بچپن گذارنے والے اورنگ زیب کو راجدھانی سے دور رکھا گیا۔ ناتجربہ کار، آرام طلب اور بے بنیاد باتوں پر یقین کرنے والے دارا کو تخت نشین کرنے کی شاہجہاں کی خواہش سیاسی ماحول کو آخر کس نتیجہ پر پہنچاتی۔ مگدھ کے راجہ اجات شترو نے یہ محسوس کیا کہ اس کا باپ بدھ مذہب سے متاثر ہو کر گوتم بدھ کی مانند گدی چھوڑ دیگا اور خزانہ کو مفلسوں اور مذہبی لوگوں میں تقسیم کر دیگا تو اس نے جلد سے جلد اپنے باپ کو مار کر گدی حاصل کر لی۔ اورنگ زیب سالہا سال تک دشمنوں سے ٹکراتے ہوئے سلطنت کو وسیع اور مضبوط کرتا رہا پھر بھی شک اور نفرت کا نشانہ بنا رہا۔

شاہجہاں کی خواہش اور جان لیوا بیماری کی خبر سن کر اورنگ زیب اپنے قابل اعتماد قاصدوں کے ذریعہ مراد کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب رہا۔ ان دونوں نے دارا کی مخالفت میں شجاع کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی لیکن کافی دور رہنے کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔

قرآن کو گواہ مان کر اورنگ زیب نے سلطنت کے بٹوارہ کا ایک مسودہ تیار کیا جس کی رو سے پنجاب، افغانستان کشمیر اور سندھ مراد کو دینے کا فیصلہ کیا گیا جس پر وہ ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کرتا۔ مغل سلطنت کا باقی حصہ اورنگ زیب کے قبضہ میں ہوتا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ لڑائی میں حاصل ہوئے مال غنیمت کا ایک تہائی حصہ مراد کو اور باقی دو تہائی اورنگ زیب کو ملتا۔[29] مراد تمام فوجی طاقت کو ساتھ لے کر ۱۴ اپریل ۱۶۵۸ کو مالوہ کے پاس دیپال پور میں اورنگ زیب سے جا ملا۔

جادوناتھ سرکار کے مطابق بیجاپور کی لڑائی کے خاتمہ (۴ اکتوبر ۱۶۵۷ء) سے لے کر تخت حاصل کرنے (۲۵ جنوری ۱۶۵۸ء) تک کا زمانہ اورنگ زیب نے کافی پریشانیوں اور تفکرات میں گذارا۔[30] حادثات بڑی تیزی سے رونما ہوتے رہے جنھیں روکنا یا کسی طرح ٹالنا اورنگ زیب کے لیے ممکن نہیں تھا۔ مسائل روز بروز بڑھتے جا رہے تھے اور اس کا مستقبل بالکل تاریک تھا۔ اس وقت جن چھوٹی بڑی مشکلات پر اس نے قابو پایا وہ سب ہمیں اس کے تحمل، ہوشیاری، چستی، فوج منظم کرنے کی صلاحیت اور اصول پرستی کی تعریف کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

شاہجہاں کے وفات پانے سے پہلے اورنگ زیب نے بغاوت نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن تیزی سے رونما ہونے والے واقعات نے اُسے دوسرا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ جنوری ۱۶۵۸ء کے لگ بھگ اس نے اپنا سارا پروگرام طے کرلیا خفیہ طریقہ سے راجدھانی کے درباریوں اور صوبوں کے اعلیٰ عہدیداروں سے مل کر اورنگ زیب خفیہ تدبیریں کرنے لگا۔ اپنی اہلیت اور تجربہ کے لیے چاروں بھائیوں میں اسی کی شہرت تھی۔ بہت سے سردار اور اعلیٰ افسران اسے ہی مستقبل کا بادشاہ مانتے اور حمایت کرنے کے لیے بے چین رہتے۔ تیس (۳۰) ہزار فوج اور سامان حرب کے ساتھ ساتھ اورنگ زیب کے پاس لائق عہدیداروں کی ایک بہت بڑی جماعت تھی۔ دکن کی صوبہ داری کے زمانہ میں اس نے اچھے کارندوں کی جمعیت بنائی تھی جو اسکیلیے جان تک دینے کو تیار رہتے۔

گدّی حاصل کرنے کے لیے اورنگ زیب ۵ فروری ۱۶۵۸ء کو روانہ ہوا۔ راستہ میں دونوں بھائیوں مراد اور شجاع کی فوجیں بھی مل گئیں۔ مغل سردار جے سنگھ نے اورنگ زیب کو روکنا چاہا لیکن آپسی بدگمانی، پلاننگ کی خرابی (ناقص منصوبہ بندی)، ناتجربہ کاری اور تنگ مزاجی کے باعث نیز بہتر ہتھیاروں کی کمی کی وجہ سے وہ اورنگ زیب سے ہار گیا۔ اورنگ زیب کی فوج میں بہترین انگریز توپچیوں کے ہونے سے شاہجہاں کے سپہ سالار جے سنگھ کا ہارنا یقینی تھا۔ شاہجہاں کے تقریباً ۶ ہزار فوجی مارے گئے۔ اورنگ زیب اب آگرہ کے پاس پہنچ گیا۔ دارا اپنی پوری تیاری کے ساتھ اورنگ زیب سے مقابلہ کرنے نکلا اور اپنے دشمنوں کی نقل و حرکت دیکھنے لگا اور شام ہوتے دونوں طرف کی فوجیں واپس ہوگئیں۔ اگر دارا اسی وقت حملہ کر دیتا تو اورنگ زیب ہار سکتا تھا کیونکہ لمبی دوری طے کرنے کی وجہ سے اس کی فوجیں کافی تھک گئی تھیں۔ رات بھر آرام کرنے کے بعد اورنگ زیب کی فوجیں پھر سے تازہ دم ہوگئیں۔ پچاس ہزار فوجیوں کے ساتھ دارا نے جنگ شروع کی اور آخر میں اورنگ زیب کا سامنا کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ دارا کے دس ہزار فوجی مارے گئے۔ ساموگڑھ کی لڑائی کے بعد اورنگ زیب نے یہ کہتے ہوئے مراد کو مبارک باد دی کہ یہ جیت مراد کی بہادری کا نتیجہ تھی اور مراد کے دور حکومت کی ابتدا اُسی دن سے ماننا چاہیئے۔

اب شاہجہاں کی اورنگ زیب نے کھل کر مخالفت شروع کر دی۔ آگرہ کو فتح کرکے وہاں امن و امان قائم رکھنے کے لیے اس نے اپنے لڑکے محمد سلطان کو بھیجا۔ آگرہ کے قلعہ میں بند ہو کر شاہجہاں وہیں سے اورنگ زیب کے خلاف حملہ کی تیاری کرنے لگا اور اورنگ زیب نے قلعہ کا محاصرہ کرلینا مناسب سمجھا اور دشمنوں کی طاقت کمزور کرنے کے لئے اس نے قلعہ کی دشمن فوج کے لیے پینے کا پانی حاصل کرنے کے ذرائع بند کرا دیے۔ اس صورت میں شاہجہاں نے تین دن تک قلعہ کا دروازہ بند رکھا اور آخر کار اورنگ زیب کی فوج قلعہ میں داخل ہوگئی۔ اورنگ زیب شاہجہاں کے خلاف خون کی ندیاں بہا سکتا تھا لیکن ایسا نہ کرکے شاہجہاں کو محل کے اندر قید کر دیا۔ شہزادی جہاں آرا بہن ہونے کے ناطے سے اورنگ زیب کو مناتے اور اس پر اپنا اثر

ڈالتے آئی اور سلطنت کو چاروں بھائیوں میں تقسیم کرنے کی تجویز رکھی لیکن اورنگ زیب نے جہاں آرا کی اس تجویز کو قطعی تسلیم نہیں کیا۔ جہاں آرا کی بات شاہجہاں کے حق میں جاتی۔ ایک باپ ہونے کے ناطے اُسے چاروں لڑکوں کے حق میں ہونا بھی چاہیئے تھا اور اگر ایسا ہوتا تو شاید شاہجہاں کو یہ دن دیکھنے نہ پڑتے۔

ادھر غلط مُشیروں کے بہکاوے میں آکر مراد اورنگ زیب کی کھلے عام مخالفت کرنے لگا۔ اورنگ زیب نے مراد کو ۲۳۳ گھوڑے اور بیس لاکھ روپیہ دے کر اس کے شک کو ختم کر دیا لیکن خفیہ طریقہ سے معلوم ہوا کہ گدی حاصل کرنے میں مراد اورنگ زیب کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا ہے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے مراد کو بلوا کر کافی شراب پلائی اور اس کے سارے ہتھیار چھین کر قید خانہ میں ڈال دیا۔ یہاں ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ اگر اورنگ زیب چاہتا تو دھوکے سے شاہجہاں اور باغی مراد دونوں کو قتل کرا سکتا تھا' اس لیے کہ تمام طاقت اس کے ہاتھ میں آچکی تھی لیکن جیسا اوپر بھی بتایا گیا ہے وہ ہمیشہ تحمّل اور تدبیر سے کام لیتا تھا۔ گوالیار کے قلعہ میں مراد تین سال تک زندہ رہا اور ۴ دسمبر ۱۶۶۱ء کو دو غلاموں نے اسے مار ڈالا۔

۵ جون ۱۶۵۸ء کو دارا دہلی پہنچا اور اورنگ زیب کے خلاف دوبارہ فوجی تیاری کرنے لگا۔ (۳۱) نے لاہور میں بیس ہزار سپاہیوں کی ایک فوج اکٹھّی کی۔ اورنگ زیب بھی دارا کا پیچھا کرتا رہا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۶۵۸ء کو دارا سیہوان بھاگ گیا اور وہاں بھی جب اورنگ زیب سے اس کا پیچھا نہیں چھوٹا تو ۱۲ نومبر کو ٹھٹّہ جا پہنچا۔ پھر ۱۶ نومبر کو وہ گجرات کی طرف بھاگا' اور اورنگ زیب نے اپنی فوجیں واپس بلالیں۔

اسی دوران دارا فوجی تیاری کرنے لگا اور کئی مشہور راجپوت اور دوسری طاقتوں کو اپنا طرفدار بنالیا۔ کھجوا میں مرزا راجہ جے سنگھ کی مدد سے اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کو اپنی طرف ملا لیا۔ کافی تیاری کے ساتھ دارا اور اورنگ زیب کی فوجیں آپس میں ٹکرائیں' فیصلہ حسب سابق ہوا دارا پھر بھاگا اور ایک افغانی سردار نے دھوکے سے دارا' اس کے چھوٹے لڑکے اور اس کی دونوں لڑکیوں کو قید کر کے اورنگ زیب کے ایک عہدیدار بہادر خاں کے سپرد کر دیا۔ اورنگ زیب نے دارا کی قسمت کے فیصلہ کے لیے اپنے وزیروں سے خفیہ مشورہ کیا۔ برنیئر کے سرپرست دانش مند خاں نے اس کی جان کی حفاظت کی سفارش کی لیکن شائستہ خاں' بہادر خاں اور حرم میں بیٹھی چھوٹی بہن روشن آرا نے سلطنت کی بھلائی کی خاطر دارا کے قتل کی حمایت کی۔ علمائے اسلام نے بھی دارا کے قتل کی تائید کی۔

اس دوران شجاع نے ایک اور فوج منظم کر لی تھی اور تخت حاصل کرنے کی جانب ایک اور کوشش کرنے کے لیے الہ آباد سے آگے تک بڑھ آیا تھا۔ لیکن ۵ جنوری ۱۶۵۹ء کو اورنگ زیب کی فوجوں نے اسے کھجوا کے پاس ہرا کر

بنگال کی طرف واپس بھگا دیا اور خشکی اور تری پر دو سال تک جنگ کے بعد ۱۲ مئی ۱۶۶۰ء کو اُسے وہاں سے بھی بھاگ کر اراکان جا کر پناہ لینے کے لیے مجبور کر دیا گیا۔ یہاں جس برمی راجہ کی مہمانی کے سہارے وہ رہ رہا تھا اسی کے خلاف ہنگامہ کرنے کے الزام میں اس کے اہل وعیال کو قتل کر دیا گیا۔ کچھ لوگوں کے ساتھ وہ جنگل میں بھاگا جہاں ماگھ لوگوں نے اسے مار ڈالا۔

مندرجہ بالا تمام مسائل اور مشکل حالات سے مقابلہ کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کے بعد اورنگ زیب کو گدّی ملی اس کی حکمرانی کی مدّت پچاس سال اور اگر صوبہ داری کے عہد حکومت کو جوڑ دیا جائے تو ساٹھ سال ہوتی ہے۔

باب - ۲

اورنگ زیب اور اس کا نظریہ

شاہراہِ تاریخ عہد وسطیٰ سے عہد جدید کی طرف مڑتی ہے۔ اسی موڑ پر اورنگ زیب کی عظیم شخصیت ہندوستان کی سبھی سمتوں سے دکھائی دیتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں تین بادشاہوں موریہ شہنشاہ اشوک، محمد بن تغلق اور اورنگ زیب کی سلطنت وسیع ترین رہی۔ بہت سے دانشوروں نے مغل سلطنت کے زوال کے لیے اورنگ زیب کو قصوروار ٹھہرایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دور مغلیہ کا سب سے ظالم بادشاہ بھی۔ مغل سلطنت کی بقا کے لیے اس نے اپنے بیٹوں کو جس قدر تربیت یافتہ بنانا چاہیے تھا نہیں بنایا اور نہ ہی خاندان کے لوگوں پر کبھی بھروسا کیا۔ اورنگ زیب کی جو تصویر ان دانشوروں نے پیش کی ہے، اسے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ :-

۱- گدّی کے لالچ میں اپنے باپ شاہجہاں کو قید میں ڈال دیا۔

۲- وہ اتنا ظالم تھا کہ اپنے بھائی دارا شکوہ کو جان سے مار دیا۔

۳- اپنی سلطنت کو اتنا وسیع کیا کہ اس کا زوال یقینی ہو گیا یعنی سلطنت کو وسیع کرنا مناسب نہیں تھا۔

۴- وہ ایک ناعاقبت اندیش بادشاہ تھا کیونکہ کتنے ہی سال اس نے دکن کی بغاوتوں کو دبانے میں برباد کیے اور ناکام رہا۔

۵- جاٹ، سکھ اور مرہٹوں کی بغاوتوں کو تو وہ ختم کر ہی نہیں سکا۔ دکن کے مسلمان اس کے ظلم سے تنگ آ کر مرہٹوں سے مل گئے۔

۶- ہندوؤں پر اس نے کبھی بھروسہ نہیں کیا اور اہم عہدوں پر صرف مسلمانوں کا تقرر کیا۔

۷- ذاتی مقصد برآری کے لیے وہ شیعوں کا بھی دشمن بن گیا۔

۸- مذہبی نظریہ کے تحت اس نے بے شمار ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنایا۔

۹- اس کے عہد میں سب سے زیادہ ہندو مارے گئے۔

۱۰۔ ہندوستان کے سبھی مشہور مندروں کو نہ صرف لوٹ کر برباد کیا بلکہ بہت سے مندروں کو توڑ کر ان پر مسجدیں بنا دیں۔

۱۱۔ اس کے زمانہ میں ماتحت حکام کافی پریشان رہے۔

۱۲۔ ہندؤں پر اس نے جزیہ لگایا اور نہ دینے والے جبراً مسلمان بنا دیئے گئے۔

اورنگ زیب کی شخصیت میں بتائی گئی مندرجہ بالا خرابیوں پر غور کریں اس سے پہلے ان برائیوں پر تنقیدی نظر ڈالنا ضروری لگتا ہے۔ کسی بھی حکمراں یا عہد کا ادھورا مطالعہ کرنا جانب دارانہ مطالعہ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ تاریخ کا صحیح مطالعہ وسعت نظری اور غیر جانبدارانہ ڈھنگ سے کرنا انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔

ہندوستان کی مشہور مگدھ سلطنت کا حکمراں بمبسار بدھ مذہب سے اتنا متاثر تھا کہ حکمرانی کا اس کا شوق ہی ختم ہوگیا۔ گوتم بدھ کے جمہوری خیالات سے وہ کافی متاثر تھا۔ اس کا بیٹا اجات شترو اپنے باپ کے اس خیال سے اتنا ناراض ہوا کہ بمبسار کو جان سے مار کر وہ راجگیر میں مگدھ سلطنت کا حکمراں بن بیٹھا۔

اپنے ایک بھائی کو مارنے پر اورنگ زیب کو ظالم کہا گیا لیکن بودھ ذرائع کے مطابق موریہ شہنشاہ (اشوک) نے اپنے ۹۹ بھائیوں کو مار کر گدی حاصل کی۔ سو واں اور سب سے چھوٹا بھائی تس کو پہلے تو چھوڑ دیا گیا اور بعد میں حکومت پر قبضہ کرنے کا الزام لگا کر اسے بھی مروا دیا۔ کلنگ کی لڑائی میں اس نے ایک لاکھ آدمیوں کو مارا اور ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کو قیدی بنایا۔ "اسوکا وادان" کے مطابق اشوک نے بدھ مٹھوں میں رہنے والے سبھی مذہبی پیشواؤں کے قتل کا حکم دیا۔ کیونکہ وہ سب تارک مذہب تھے۔ ایک بار "حرم سرا" کی عورتوں نے اسے بدصورت بتایا تو پانچ سو عورتوں کو زندہ جلوا دیا اور وہ "چانڈ اشوک" یعنی ظالم اشوک کہلایا۔ اس نے ایک ایسا مقام مخصوص کیا اور ایسے آلات اور افراد کا تعین کیا جن کا کام بے قصور لوگوں کو پکڑ کر سخت ایذائیں پہونچانا تھا۔ ان جہنم نما مقامات کی دیکھ بھال خود کیا کرتا تھا۔ ایک سات سال کے بھکشو نے اشوک کو بودھ بنایا اور اسی بھکشو کے کہنے پر اس نے بدھ مذہب کی مخالفت کرنے والے برہمنوں کو قتل کرا دیا۔

مندرجہ بالا کارناموں کے باوجود دانشوروں نے اشوک کو امن پسند اور عظیم شہنشاہ کے خطابات سے نوازا ہے۔ تاراناتھ کے خیالات کو تسلیم کرتے ہوئے رومیلا تھاپر بتاتی ہیں کہ کتنے ہی سال اشوک نے آرام طلبی کی زندگی گذارے، اور دھما شوک (مذہبی) چانڈ اشوک (خونریزی) کے علاوہ کاما شوک (نفس پرست) بھی کہلایا۔

بودھ ماخذ میں بیان کردہ مندرجہ بالا باتوں کو اشوک نوازوں نے من گھڑت اور پران میں ملنے والی کہانیوں کے مانند بتایا لیکن یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ اشوک کی حمایت میں جس قدر باتوں کی معلومات اس کے کتبوں سے ہوتی ہیں وہ سب درست ہیں یہ کس طرح سمجھ لیا جائے؟

موریہ سلطنت کے برہمن سپہ سالار پُشیہ متر شُنگ نے آخری موریہ بادشاہ ورہ درتھ کو جان سے مار کر شُنگ خاندان کی بنیاد ڈالی۔ برہمن مذہب کی ترقی کے لیے نہ صرف اس نے بہت سی بدھ عبادت گاہوں کو برباد کیا بے شمار بودھوں کو قتل کیا بلکہ ایک فرمان جاری کر دیا (جس کی رو سے) جو کوئی اسے ایک بدھ بھکشو کا سر کاٹ کر پیش کرتا اسے سو دینار کا انعام دیا جاتا۔[۱۲]

کسی بھی حکمراں کا پہلا فرض سلطنت کو وسیع کرنا ہوتا ہے اور یوں تو چھوٹی سے چھوٹی سلطنت بھی بڑی سلطنتوں کی طرح برباد ہو جاتی ہے۔

جاٹ، سکھ، مرہٹوں اور راجپوتوں کی بغاوتوں کی بنیاد پر اورنگ زیب کو انتظام حکومت کے معاملہ میں اس کی انتظامی کمزوری یا اسے خارج از عقل بادشاہ کہنا مناسب نہیں لگتا کیونکہ پہلے کے واقعات اور الجھنوں پر دھیان نہ دے کر موجودہ ہندوستان ہی پر دھیان دینے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آسام، پنجاب، نکسلواد، گورکھالینڈ وغیرہ مسائل سے متعلق گرم ہوائیں چلتی رہی ہیں اور آج بھی چل رہی ہیں۔ ان مسئلوں کے لیے محض راجہ، وزیر، وزیر اعظم یا سرکار کو موردالزام ٹھہرانے سے پہلے متنازعہ اسباب پر کافی گہرائی سے سوچنے اور غور کرنے کے بعد ہی ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔

اورنگ زیب کی مخالفت کرنے والے مورخین نے یہ جو کہا ہے کہ اس نے اپنے بیٹوں اور خاندان کے دوسرے لوگوں پر بھروسا نہیں کیا تو کیا یہ لوگ بھی ہندو تھے۔ دکن سے متعلق حکمت عملی دراصل اورنگ زیب کی توسیع پسندی کو ظاہر کرتی ہے نہ کہ زوال پذیری کو۔ زیادہ تر مغل بادشاہوں کو ہم گدی کے آس پاس ہی منڈلاتا ہوا پاتے ہیں جبکہ اورنگ زیب بیماری کی حالت میں بھی اپنی صوبائی سالمیت کے لیے دوڑتا رہا۔[۱۳] دکن میں ہو رہی بغاوتوں کو دبانے میں ناکام رہنے کے باوجود وہ جنوبی ہند کو آزادی دینے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ چاہتا تو دکن کے باغیوں کو خراج دینے پر راضی کر کے انھیں دوسرے بادشاہوں کی طرح خود مختار بنا سکتا تھا۔ لیکن دکن کو اس نے ہمیشہ کل ہندوستان کا ایک حصہ سمجھا اور یہ بات یقیناً اس کے عظیم مقصد اور سوچ کی مظہر ہے۔ کیونکہ پہلے کے بہت سے حکمرانوں کو ہم نے ایسا پایا ہے کہ انھوں نے سارے ہندوستان کو ایک ملک اور تمام ہندؤں کو اپنا بھائی بندھو سمجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی چھوٹی چھوٹی مملکتوں کے مفاد اور عوام کا استحصال کرنے میں دلچسپی لی۔ جہاں تک شیعہ مخالف ہونے کا سوال ہے وہ شیعہ مخالف، باپ مخالف یا بھائی مخالف نہیں بلکہ گدی پسند تھا اور گدی کے لیے کوئی بھی چال سیاست کے لحاظ سے غلط نہیں ہوتی۔ ویسے شیعوں کے حق میں اس کی خاص ہمدردی تھی جس کا علم ایک وصیت نامہ[۱۴] سے اس طرح ہوتا ہے: "جب میں مر جاؤں تو میری سچی ہوئی

ٹوپیوں کی قیمت میں سے چار روپیہ دو آنہ نوکرانی بیگا کے پاس ہیں اسی پیسہ سے میرے کفن کا کپڑا[14] خریدا جائے۔ میرے اپنے خرچ کی تھیلی میں قرآن نقل کرنے کی محنت سے حاصل ہوئے تین سو بچاس[15] روپئے ہیں چونکہ قرآن کی نقل کے ذریعہ کمایا ہوا پیسہ شیعہ فرقہ کے نزدیک نا جائز سمجھا جاتا ہے اس لیے اس سے کفن نہیں خریدا جائے اور نہ ہی دوسری ضرورتوں پر خرچ کیا جائے۔ جس افسر کی آخری جانچ کے بعد اورنگ زیب کھانا کھاتا اس کا نام نعمت خان عالی تھا اور وہ شیعہ مسلمان تھا۔

اس شیعہ مسلمان کو اورنگ زیب اتنا چاہتا تھا کہ ایک بار ظفر خاں کے بیٹے کامگار خاں نے نعمت خانِ عالی کے خلاف یہ کہتے ہوئے شکایت کی کہ اس نے اُسے (کامگار خاں) اور اس کی بیوی کو "دو زنانوں کا ملن ہوا" لکھ کر کھلے عام کافی شرمندہ کیا۔ اس کے لیے اس نے اورنگ زیب سے نعمت خاں عالی کو سخت سزا دینے کی جب درخواست کی تو اورنگ زیب نے لکھا "اسے سزا دینے سے تمہاری اور بے عزتی ہوگی یہ سیدھا سادہ خاندانی خدمت گزار لوگوں میں بے عزت کرنے میں مجھے بھی شامل کئے بغیر نہیں چھوڑتا اور پہلے بھی مذاق اڑانے سے نہیں چوکا۔ میں نے اس کا انعام بڑھا دیا ہے تاکہ پھر وہ ایسا نہ کرے لیکن اب بھی مجھے اس کی امید نہیں لگتی کہ وہ میرا مذاق اڑانا کم کردیگا۔ اس کی زبان یا اس کا گلا اس بات کے لئے کاٹنا ممکن نہیں ہے"۔

مندروں کو لوٹنے کا کام مسلمانوں سے زیادہ ہندو حکمرانوں نے کیا ہے کسی بھی مسلمان حکمراں کے عہد حکومت میں مندروں کو لوٹنے والا محکمہ قائم تھا اس سے متعلق کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن بارہویں صدی میں کشمیر کے ہرش نامی حکمراں نے "مندرلوٹ" محکمہ ہی قائم کردیا تھا جس کا کام مندروں کو لوٹنا تھا[16]۔ جس قدر مال و دولت مندروں کو لوٹ کر حاصل ہوتی اس میں سے آدھا انعام بطور وہ لیٹرے سپاہیوں میں تقسیم کرکے باقی راجہ خود لے لیتا۔ اقتصادی مسائل کو سلجھانے کے سلئے مندروں کی کل جائداد لوٹنے کی عادت مسلسل جڑ پکڑتی گئی۔ بھگتوں کے ذریعہ سونپی جانے والی املاک کے علاوہ اس نے دیوتاؤں کی دھات کی بنی ہوئی مورتیوں کو بھی مندر سے نکلوانے کے لیے اودے راج کو "دیووتپاٹن نایک" بنایا[17]۔ دیوتاؤں کی مورتیوں کو لوٹنے سے پہلے اودے راج ننگے بھکشوؤں کے ہاتھ سے ان پر پاخانہ اور پیشاب چھڑکواتا تھا۔ مورتیوں کے پیروں میں رسی باندھ کر انھیں سڑک پر گھسیٹا جاتا تھا[18]۔ مملکت کے کسی گاؤں، قصبہ یا شہر میں ایسا ایک بھی مندر نہیں بچا جس میں دیو مورتی نہ توڑی گئی ہو۔ شری رن سوامی اور شری مارتنڈ دیو کی مورتیوں کے بچ جانے کا ذکر کلہن نے کیا ہے[19]۔ بھگوان بدھ کی بھی دو مورتیاں بچ گئیں۔ دیو مندروں کے پوجا وغیرہ کے انتظام کے سلسلے میں دیئے گئے گاؤں کو بھی ہرش نے اپنے تحت میں لے لیا[20]۔ پرمار حکمراں سوبھٹ ورمن (۱۱۹۳ء-۱۲۲۰ء) نے گجرات پر حملہ کرکے ڈبھوئی اور کھمبات کے کتنے ہی جین مندروں کو لوٹا تھا[21]۔ ہزاروں خاندانوں کو لوٹ کر دولت حاصل کرنے کے مقابلے

کسی مندر کو لوٹ کر دولت حاصل کرنا کئی زاویوں سے حکمرانوں کو بہتر لگا۔ کیونکہ مندر میں جمع شدہ لامحدود دولت بدعنوانی کا اصل باعث رہی ہے۔

حکومت کے ملازمین کے بیچ پھیلی بدعملی اور رشوت کم کرنا، عمال کے لیے تکلیف کا باعث ہو سکتا ہے عام لوگوں کے لیے نہیں۔

اس نے (یعنی اورنگ زیب نے) متھرا اور بنارس کے مندروں کو اگر نیست و نابود کروایا تو گولکنڈہ کی مسجد کو بھی برباد کیا کیونکہ حکومت کے خلاف حرکات و سکنات ان تینوں مقامات پر موجود تھے۔ بنارس کے کاشی وشوناتھ مندر کو توڑنے اور اس پر مسجد بنانے کا الزام اورنگ زیب پر لگایا جاتا ہے جس کا ٹھوس ثبوت نہیں ملتا۔

اب رہا یہ سوال کہ مغل سلطنت کے زوال کے لیے اورنگ زیب کتنا ذمہ دار تھا تو کسی بھی سلطنت کے زوال یا عروج کے لیے کسی ایک آدمی کا ہاتھ ہی کام نہیں کرتا۔ زوال یا عروج کے صحیح اسباب کو معلوم کرنے کے لیے اس زمانہ کی اقتصادی، سائنسی، سماجی، سیاسی، مذہبی اور تہذیبی کیفیات پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا ہی چیزیں عروج یا زوال کی بنیاد ہوتی ہیں نہ کہ صرف ایک فرد۔ پھر مغل سلطنت کے زوال کی بات اسی صورت میں درست ہوتی جب ہندوستان کے تخت شاہی پر کوئی دوسرا ملک گیر طاقت رکھنے والا ہندوستانی قابض ہو جاتا۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مغلوں کے بعد غیر ملکی طاقت انگریزوں کا ہندوستان پر قبضہ ہوا۔ چنانچہ اس صورت میں "مغل سلطنت کا زوال" کہنے کے مقابلہ میں اگر ہم اسے ہندوستانی سلطنت کا زوال کہیں تو زیادہ منصفانہ بات ہوگی۔

اورنگ زیب کا زمانہ حکومت تقریباً پچاس سال (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) کا رہا۔[22] اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی اعتبار سے وہ ایک کٹر مسلمان تھا لیکن وہ ایک حکمراں بھی تھا۔ اس حقیقت کو وہ بھول نہیں سکتا تھا کہ بڑی آبادی ہندوؤں کی تھی جو اپنے مذہب اور عقیدہ کے لحاظ سے پکے تھے۔ تلوار کے ذریعہ ان کے دل و دماغ پر اسلام کا اثر ڈالنا ممکن نہیں تھا اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ بہت سے ہندوؤں کو اس نے مسلمان بنا بھی دیا تو کس لیے؟ نہ تو ان پر اعتماد کرنا ممکن تھا اور ہندوؤں کی مخالفت کا مسئلہ الگ تھا۔ ایسا کوئی بھی اصول جس کی وجہ سے ہندو رعایا اور طاقتور ہندو راجہ اور زمیندار مخالف ہو جائیں تو اورنگ زیب کی ناکامی یقینی تھی اور اورنگ زیب اس نکتہ سے اچھی طرح باخبر تھا۔[23]

۱۶۵۹ء میں اس نے سکوں پر کلمہ کھدوانا بند کر دیا۔[24] اس کا خیال تھا کہ جب سکے ہندو اور مسلمان دونوں کے ذریعہ استعمال کیے جاتے ہیں تو اس صورت میں سکوں کی بناوٹ عمومی ڈھنگ کی ہونی چاہیے۔[25]

شاہجہاں نے شراب بنانے اور اس کے فروخت کیے جانے کو بند کرنے کا حکم جاری کیا لیکن اس حکم پر عمل نہیں ہوا۔

اورنگ زیب اس سے واقف تھا۔ شراب پر کنٹرول کے لیے اس نے ایک نیا محکمہ قائم کیا۔[26] پکڑے جانے پر شراب فروخت کرنے والے کو سخت سزا دی جاتی۔[27] شراب نوشی کی وجہ سے ایک راجپوت منصب دار کو سزا کے طور پر تبادلہ کر دیا گیا۔ ایک مفتی کو سزا دی گئی۔[28] شراب پینے کی وجہ سے ۶ مئی ۱۷۰۲ء کو راجہ مان سنگھ راٹھور اور دوسرے عہدیداروں کے عہدے گھٹا دیے گئے۔[29] شراب نوشی کی حوصلہ افزائی کے سبب دیوان حافظ کے نسخے ضبط کر لیے گئے۔[30] یورپیوں کو شراب کے استعمال کی اجازت تھی مگر ان کے مکان شہر سے باہر رکھے گئے تھے۔[31] منوچی کے مطابق قاضی القضاۃ جسے اورنگ زیب بے قصور سمجھتا تھا وہ بھی شراب پیتا تھا۔[32]

طوائفوں اور رقاصاؤں کو شادی کرنے یا سلطنت سے نکل جانے کا حکم دیا گیا لیکن اس حکم پر پوری طرح عمل نہیں ہوا۔[33]

ہندو بیویوں کو مرنے والے شوہروں کے ساتھ بغیر اپنی مرضی کے ستی کیے جانے پر پابندی جاری رہی۔[34] بھنگ کی کاشت، فروخت اور کھلم کھلا استعمال پر پابندی لگا دی گئی۔[35] قمار بازی بند تھی۔[36] محرم دکھ اور سوگ کے ماحول سے متعلق تھا لیکن لوگ اسے خوشی کی شکل میں منانے لگے تھے۔[37] اس لیے ۱۶۶۴ء میں محرم کی تقریبات پر پابندی لگا دی گئی۔ ۱۷۰۰ء میں محرم منانے کی وجہ سے احمد آباد کے حاکم کو تین ہزار پانچسو کے منصب سے ہٹا کر تین ہزار کے منصب پر کر دیا گیا۔[38]

اُسے ہم ناروا کہہ سکتے ہیں لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے کہ گانا، بجانا یا رقص اور مذہب میں طرح طرح کی تبدیلیوں سے متاثرہ ادب کی تخلیق بڑے پیمانہ پر ہندوستان میں اس زمانہ میں ہوتی ہے جب شہر، بیوپار، بیوپاری اور مرکزی طاقت وغیرہ کی حالت خراب ہو جاتی ہے یعنی افراتفری کے زمانہ میں۔ تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ مغل دور میں مسلم یا غیر مسلم پر دھیان دیے بغیر فنکاروں کو شاہی سرپرستی حاصل ہوئی اور مشہور جہاں عمارتوں جیسے تاج محل کی تعمیر بھی ہوئی۔ غور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عوام کا دھیان اصل مسئلوں سے ہٹانے اور بھیڑ اکٹھا کرنے میں ناچ گانے کی افادیت ہو لیکن آج بھی بڑے بڑے عالم یا سائنس دانوں کو جو لطف یا خوشی کسی نئی تلاش یا تحقیق سے ہوتی ہے وہ سینما، ٹیلی ویژن یا ناچ گانا دیکھ کر نہیں ہوتی۔

تخت نشینی کے بعد گیارہویں سال میں اورنگ زیب نے گلوکاروں کو دربار میں ناچنے گانے سے منع کیا کیونکہ اس کے سبب اورنگ زیب کو بحیثیت بشر یکسوئی کا فقدان اور اہل کاروں کے کام کی رفتار میں کمی کا احساس ہوا جو عام زاویہ نگاہ سے غلط ہو سکتا ہے[39] لیکن ضروری نہیں کہ بادشاہ کی نظر بھی تمام درباریوں کے مانند ہو۔ شری جادو ناتھ سرکار نے ناچ گانے سے اورنگ زیب کی دربار میں لگائی گئی پابندیوں کو اس طرح لکھا ہے۔ جیسے اورنگ زیب خشک مزاجی اور اسی قسم کے خیالات رکھتا تھا جب کہ حقیقت یہ تھی کہ دربار کے باہر دنیا بھر کے ناچنے اور گانے والے موجود تھے۔

پیروں، ولیوں کے گانے (قوالی وغیرہ) کے پروگراموں کو غیر شرعی (ناجائز) قرار دیا گیا[40] لیکن یہ لوگ باز نہیں

آئے[41]۔ احمدآباد کے مشہور صوفی محی چشتی نے اورنگ زیب کے اس حکم کی مخالفت کی[42]۔ شیخ کی مجلس سماع پر جب محتسب مرزا باقر نے پابندی لگانی چاہی تو شیخ اور ان کے مریدوں نے اس کی مخالفت کی۔ جب محتسب نے شیخ پر طاقت کا استعمال کرنا چاہا[43] اور یہ اطلاع اورنگ زیب کو ملی تو اس نے محتسب کو حکم دیا کہ شیخ سے کچھ نہ کہا جائے۔ ایک عالم دین نے گانے کی مخالفت کرتے ہوئے، اورنگ زیب سے کہا کہ اولیا کے مزاروں پر ہونے والے گانے بجانے پر فوراً پابندی لگائی جانی چاہیے کیونکہ اس گانے بجانے کی وجہ سے مرحوم اولیا کی ہڈیاں قبر میں بے چین ہوتی ہیں اور قبر سے نکل بھاگنا چاہتی ہیں[44]۔ گانے بجانے پر پابندی لگانے کے حکم پر پوری طرح عمل نہیں ہوا۔ ایک عالم کو سڑک پر ہونے والے گانے بجانے کو خود روکنا پڑا کیونکہ محتسب نے کوئی کاروائی نہیں کی[45]۔

ستار بجانے کا اورنگ زیب خود ماہر تھا[46] اور اگر دربار میں ستار بجا کر درباریوں کی تالیوں کی گونج سن کر خوش ہوتا تب بھی اسے بُرا بادشاہ ہی کہا جاتا۔ اس کے برخلاف دوسرے لوگوں کے دربار میں ناچنے گانے پر پابندی عائد کی گئی تب بھی ہم اسے سخت بادشاہ کہیں کچھ منصفانہ بات نہیں لگتی۔

دربار میں ناچنے گانے والوں پر پابندی لگانے کی وجہ سے فن سے لگاؤ رکھنے والے لوگوں نے اس وقت اورنگ زیب[47] کا مذاق اڑایا جب وہ جمعہ کے دن مسجد جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک ہزار گوّیے اکھٹے ہوئے جن کے ساتھ سجے ہوئے تقریباً ۲۰ جنازے تھے، اور سارے گوّیے اپنی تکلیف کا اظہار کر کے زور زور سے روتے چلاتے ہوئے جا رہے تھے۔ اورنگ زیب نے ان لوگوں کی واویلا کو دور سے ہی سنا اور دیکھا۔ وجہ معلوم کرنے کے لیے اپنے آدمیوں کو بھیجا۔ گوّیوں نے کہا۔ " اپنے حکم کے ذریعہ بادشاہ نے علم موسیقی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ہم لوگ اسے قبر میں دفنانے کے لیے لے جا رہے ہیں[48]"۔ گوّیوں کے اس جواب سے اورنگ زیب کا غصّہ سے بھڑک اٹھنا عین ممکن تھا لیکن اس نے غصّہ کا قطعی اظہار نہ کر کے بڑے پُرمذاق لہجہ میں جواب دیا۔ "اسے اچھی طرح اور گہرا دفن کرنا[49]۔"

اورنگ زیب کے اس جواب کو ایک مخصوص نظریہ رکھنے والے مورخین نے اس کے خلاف بڑی اہمیت دینے کی کوشش کی ہے جب کہ بات صرف اتنی ہے کہ گانے بجانے پر پابندی لگانے کو خود موسیقاروں نے بالکل سادہ ڈھنگ سے محسوس کیا۔ اسی لیے تو انھوں نے جنازہ نکالنے کی بات کہی اور اورنگ زیب نے جس انداز میں جواب دیا اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے کسی قسم کی توہین محسوس نہیں کی اور نہ ہی ناراض ہوا۔ اس واقعہ کو ایک مزاحیہ قصّہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستانی فن موسیقی پر جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، جتنے وسیع اور اعلیٰ پیمانہ پر اورنگ زیب کے زمانہ میں کام ہوا اتنا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ فن موسیقی پر کچھ کتابوں کے علاوہ خصوصی طور پر لکھی گئی ہندوستانی زبان کی لغت "تحفۃ الہند"

جس کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے، کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جسے بہت زمانہ پہلے مشہور دانشور سر ولیم جونس نے متعارف کرایا تھا لیکن بعد کے دانشوروں نے اس کتاب کو مسلسل بھلانے اور نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہندوستانی زبان سیکھنے اور سکھانے میں اسکو اتنی دلچسپی تھی کہ اس نے یہ لغت تیار کرائی جس کے ذریعہ فارسی جاننے والا ہندی زبان کو آسانی سے سیکھ سکے ہندی اور سنسکرت شاعری اور ان سے متعلق قاعدوں اور ضابطوں کو عام کرنے کے لیے اس نے ایک قابل ذکر کتاب تصنیف کرائی۔ اس کے قلمی نسخے بھی خدا بخش پٹنہ میں دستیاب ہیں۔

اکبر کے ذریعہ شروع کی ہوئی رسم سالگرہ کو اورنگ زیب نے بند کرا دیا اس لیے کہ چھوٹے سردار اس کی وجہ سے کافی زیر بار ہوتے تھے۔[50] آگے چل کر رسیک داس نامی ایک اعلیٰ عہدیدار کو غریب کسانوں کی طرف دھیان دینے کا حکم دیا تاکہ مقامی حکام ان پر زیادتی نہ کریں۔[51]

بڑے پیمانے پر نئی مسجدوں کی تعمیر نہ کر کے اس نے شکستہ اور پرانی مسجدوں کی مرمت اور درستی کرائی۔ ان مسجدوں کے اماموں، مؤذنوں اور خطیبوں کو خزانہ سے مشاہرہ دیا جاتا تھا۔[52] ستارا کے قلعہ پر دھاوا بولنے والوں میں سے ۱۲ آدمی پکڑے گئے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ دربار کے قاضی اکرم سے ان مجرموں کو سزا دینے کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے ہندوؤں کو مسلمان بنا دینے اور مسلمان مجرموں کو تین سال کی قید تجویز کی۔ قاضی اکرم کے اس فیصلہ کو اورنگ زیب نے غلط بتایا اور قاضی اور مفتیوں کو شریعت کے مطابق دوبارہ فیصلہ سنانے کا حکم دیا۔ ان لوگوں نے مفضول نے ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے سزائے موت کا فیصلہ سنایا اور اسی فیصلہ کو اورنگ زیب نے بھی منظوری دی۔[53] اورنگ زیب نے ہمیشہ اوّلیت اسی بات کو دی کہ ایک جیسی غلطی کے لیے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان سزا میں کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔

مہرالنسا کی ماں اورنگ آبادی کا انتقال طاعون کی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو کر ۱۶۸۸ء کو ہو گیا۔ اُدے پوری جو اورنگ زیب کی ضعیفی کے وقت میں اس کی رفیق اور اس کے عزیز اور لاڈلے بیٹے کام بخش کی ماں تھی، حرم میں اس وقت آئی جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا۔ سر جادو ناتھ سرکار[54] کی رائے میں وہ داراشکوہ کی ایک سرکیشین لونڈی تھی اور اسے مال غنیمت میں ہاتھ آئی تھی۔ مآثر عالمگیری نے اسے "بائی" کہا ہے اور "بائی" لفظ کا استعمال صرف ہندو عورتوں کے لیے ہوتا تھا۔[55] کچھ دوسرے دانشوروں نے اسے کشمیری عورت بتایا ہے۔[56] ان حقائق کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ہندو عورت تھی اور اورنگ زیب کی بیوی! اور اورنگ زیب کٹر مسلمان تھا اور مغلوں میں ہندو کو مسلمان بنا کر شادی کا دستور نہ تھا۔

مرہٹوں پر فتح پانے کے بعد اورنگ زیب کے ایک مقرر کردہ افسر محرم خاں نے غیر مسلموں کو غیر معتبر اور دشمن بتاتے ہوئے انھیں اعلیٰ عہدوں سے ہٹا دینے کی درخواست اورنگ زیب کو بھیجی۔ اورنگ زیب نے جواب دیا

"حکومت کے امور کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر تمہارا مشورہ قبول کرتے ہوئے اس پر عمل پیرا ہوا جائے تو میرے لیے یہ فرض ہو جائے گا کہ میں تمام ہندو راجاؤں اور ان کے ماتحتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں جو میں نہیں کر سکتا۔ ایسے افسران کو عہدے سے معزول کرنے کی حمایت سمجھ دار لوگ کبھی نہیں کرتے۔"[۵۷]

جنوبی ہندوستان میں واقع برہم پوری میں تعینات ایک افسر میر حسن نے اورنگ زیب کو اس کے برہم پوری پہنچنے سے پہلے لکھا۔ "اسلام پوری کا قلعہ کمزور ہے اور آپ عنقریب وہاں پہنچنے والے ہیں۔ قلعہ مرمت چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا حکم ہے؟" اورنگ زیب نے جواب دیا۔ "اسلام پوری لفظ لکھ کر تم نے مناسب نہیں کیا۔ اس کا پرانا نام برہم پوری تھا، تمہیں وہی لکھنا چاہئے تھا۔ جسم کا قلعہ تو اس سے بھی زیادہ کمزور ہے اس کا بھی کچھ علاج سوچا؟"[۵۸]

مذہبی قدم اس نے جو بھی اٹھایا اس سے اس کا مقصد گدی کا استحکام تھا۔ اپنے باپ شاہجہاں کو قید کرنا اور اپنے بھائی دارا کے قتل کے معاملوں میں اسلامی رہنماؤں کو اپنے حق میں ہموار کرنا اس وقت اورنگ زیب کے لیے بہت ضروری تھا اس لیے کہ وہ بادشاہ بننا چاہتا تھا۔ دربار کا قاضی القضاۃ باپ کی حیات میں اس کے بادشاہ بن بیٹھنے کو قانونی طور پر درست سمجھنے اور اس کا اعلان کرنے کو تیار نہیں تھا۔ گجرات کا قاضی عبدالوہاب اورنگ زیب سے مل گیا۔ اور جملہ قاضیوں کو یہ کہہ کر خاموش ہونے پر مجبور کر دیا کہ شاہجہاں کی صحت چونکہ بہت زیادہ گر گئی ہے اس لیے مملکت پر حکومت کرنے کے لئے اورنگ زیب کے نام سے خطبہ پڑھا جانا اسلامی قانون شریعت کے لحاظ سے جائز ہے۔[۵۹] لہٰذا اورنگ زیب بادشاہ اور عبدالوہاب قاضی القضاۃ بنے۔

اپنی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں ہی اورنگ زیب نے شریعت کے حکم کے مطابق ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں کے مندروں اور گرجا گھروں کا احترام کیا اس نے ایک قانون بنایا کہ کوئی پرانا مندر منہدم یا مسمار نہ کیا جائے۔ نئے مندروں کی تعمیر پر تو اس نے پابندی لگائی لیکن پرانے مندروں کی مرمت کی نہ صرف اجازت ہی دی بلکہ انھیں اس مقصد کے لیے مالی امداد بھی دی۔[۶۰]

مندروں کی نسبت اورنگ زیب کا یہ اصول کوئی نیا نہیں تھا۔ شاہجہاں کے زمانہ میں جب وہ گجرات کا صوبہ دار تھا تو مندروں کو نہیں بلکہ مورتیوں کو توڑنے یا مندروں کو بند کرنے کا حکم دیا تھا صرف اس وجہ سے کہ ان مندروں میں مرکز سے بغاوت کرنے والے عناصر ہمیشہ جمع رہتے تھے جب اورنگ زیب بادشاہ بنا تو اس نے دیکھا کہ اس کے باپ کے زمانہ میں جن مندروں کو بند کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ دوبارہ کھول لیے گئے ہیں اور ان میں مورتیاں نصب کر دی گئی ہیں۔ شاہی حکم کے خلاف ورزی پر اس کا غضب ناک ہونا فطری تھا چنانچہ ۱۶۶۵ء میں مندروں کو برباد

کرنے کا فرمان جاری کیا۔ سومناتھ کے مشہور مندر کو توڑنے کا حکم اس نے اپنے دور حکومت کے ابتدائی زمانہ میں ہی مسلم مذہبی رہنماؤں کو خوش کرتے اور نظم و نسق کی کامیابی کے لیے تھا۔

اس طرح یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ گدّی کے استحکام کے لیے مندر ہو یا مسجد، جہاں بھی مرکز سے باغی عناصر دکھائی دیے یا چوری چھپے جمع کیے ہوئے کثیر مال و دولت کا پتہ چلا اس صورت میں اسلام ہو یا کوئی دوسرا مذہب رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ مذہبی مقامات کے تقدس اور پُرامن ماحول قائم رکھنے کے لیے اورنگ زیب نے مندروں کی طرح مسجدوں پر بھی کڑی نظر رکھی۔

بی۔ این۔ پانڈے[۹۱] کے بقول اس کی حکومت کی پالیسی تھی کہ اس نے ہندو مندروں اور مٹھوں کیلئے وظیفے مقرر کیے[۹۲] الہ آباد میں واقع سومیشور ناتھ مہادیو کے مندر، بنارس میں کاشی وشوناتھ کے مندر، چترکوٹ کے بالاجی مندر، گوہاٹی میں واقع اُمانند مندر، شترونجی میں جین مندر اور شمالی ہند میں واقع بے شمار مندروں اور گرودواروں کے لیے اورنگ زیب نے جاگیریں وقف کیں[۹۳]۔

بنارس کے کاشی وشوناتھ مندر کو توڑنے کا الزام اورنگ زیب کے سر ڈالا گیا، لیکن ابتک اس کا ایک بھی معاصر ثبوت نہیں ملا ہے جس کی رو سے اورنگ زیب کے ذریعہ اس مندر کا توڑا جانا ثابت کیا جاسکے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جاچکا ہے کہ ہندو راجاؤں اور بادشاہوں کے ہاتھوں کتنے ہی مندر تباہ و برباد کیے گئے لیکن ان پر کوئی خاص نکتہ چینی نہیں کی گئی۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ صرف بنارس اور متھرا وغیرہ میں ہی اس کے زمانہ میں مندروں کو تباہ کرنے کی معلومات سامنے آتی ہیں۔ آخر کیوں؟ کیا ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بڑے بڑے مندر نہیں تھے؟ جنوبی ہندوستان بڑے اور اہم مندروں کے لیے آج بھی دنیا بھر میں مشہور ہے! دوسرا سوال یہ بھی قابل غور ہے کہ اگر اورنگ زیب مذہب کے معاملہ میں سخت اور کٹر مسلمان ہونے کی وجہ سے تمام مذہبی اور سماجی معاملوں کو اسلامی شریعت کے مطابق ہی انجام دیتا تھا تو کیا مندر توڑ کر اسکی جگہ مسجد تعمیر کرنے کی شریعت اجازت دیتی ہے؟ شریعت نے تو واضح الفاظ میں اس فعل کی ممانعت کرتے ہوئے دوسرے کی زمین یا کسی بھی مذہبی جگہ کو چھین کر یا قبضہ کرکے اس پر مسجد تعمیر کرنے کو اسلام کے منافی اور ناجائز بتایا ہے۔ پھر یہ بھی توجہ طلب ہے کہ مغل بادشاہ کے پاس کیا زمین کی کمی تھی جس کی وجہ سے انھیں مندروں کو توڑ کر ہی مسجد تعمیر کرنا ضروری تھا؟ آزادی سے پہلے تک ہندوستان کے تقریباً تمام ہی حصوں میں بہت کافی افتادہ اراضیات کا علم ہوتا ہے جن پر پہلے سے کوئی قابض نہیں تھا بلکہ جس نے بھی وہاں مستقل سکونت اختیار کرلی اس کی وہ ملکیت قرار پاگئی۔ پھر اورنگ زیب کے زیر حکومت

تو ملک کا سب سے بڑا رقبہ تھا اس لیے وہ کہیں بھی مسجد تعمیر کرا سکتا تھا اس کے علاوہ اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مسجدیں تعمیر کرانے کا اورنگ زیب شوق نہیں رکھتا تھا۔ اس کے عہد حکومت میں زیادہ تر مسجدوں کی مرمت اور درستی کا ہی کام ہوا ہے۔

تقریباً سارا ہندوستان اورنگ زیب کے زیر حکومت رہا پھر بھی ہندو مذہب اپنی انفرادی حیثیت قائم کیے رہا۔ اورنگ زیب یقیناً اس حقیقت سے باخبر تھا کہ ہندو دھرم کو ٹھیس پہنچا کر اس کے ماننے والوں کے غم وغصّہ کو بھڑکانا مناسب نہیں۔ محض یہی سبب ہے کہ اس کے زمانہ میں زیادہ تر مندروں کا مذہبی تقدس برقرار رہا۔

مذکورہ بالا ماحول کی روشنی میں ہمیں اورنگ زیب کے عہد حکومت اور اس کے مذہبی نظریات کو سمجھنا ہوگا۔ بنارس کے کاشی وشوناتھ مندر کو توڑنے کے سلسلہ میں پی. سیتارام ناتھ نے نہایت اہم ثبوت پیش کیا ہے جسے بی. این پانڈے نے بھی اپنے مضمون میں بطور حوالہ تحریر کیا ہے[۲۵]۔ وہ لکھتے ہیں کہ: "کچھ کی آٹھ مہارانیاں کاشی وشوناتھ میں درشن کرنے گئیں۔ ان میں سے ایک حسین رانی کو مہنتوں نے اغوا کر لیا۔ کچھ کے راجہ نے اس واقعہ کی اطلاع اورنگ زیب کو پہنچائی۔ پہلے تو اورنگ زیب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ ہندوؤں کا آپسی معاملہ ہے اور اس میں اس کی طرف سے کوئی بھی قدم اٹھانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ لیکن جب کچھ کے راجہ نے کافی منّت سماجت کی تو اورنگ زیب نے کچھ ہندو سپاہیوں کو واقعہ کی چھان بین اور حقیقت معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ ان سپاہیوں کو مہنت کے آدمیوں نے ڈرا دھمکا دیا اور مار پیٹ کر بھگا دیا۔ اورنگ زیب کو سپاہیوں کے ساتھ کیے گئے اس برتاؤ پر ناگواری ہوئی۔ اس نے دوبارہ کچھ اہل اور بہتر فوجی جوانوں کو اصل واقعات معلوم کرنے کی غرض سے بھیجا۔ لیکن مندر کے پجاریوں نے اس مرتبہ بھی ڈٹ کر مخالفت کی۔ مغل فوجیوں نے مقابلہ کیا۔ مندر کے اندر فوجیوں اور پجاریوں کے درمیان ہوئی لڑائی کے نتیجہ میں مندر تباہ ہوا اور لڑائی کی صورت میں ایسا ہونا امکانی بات ہے۔ فوجی جب مندر کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تو انھوں نے گم شدہ رانی کی تلاش شروع کر دی۔ تلاش کے دوران خاص دیوتا (بڑے دیوتا) کے پیچھے ایک سرنگ کا پتہ چلا جس سے انتہائی ناگوار قسم کی بدبو نکل رہی تھی۔ دو دن تک دوا چھڑک کر اس بدبو کو ختم کیا گیا اور فوجی برابر پہرہ دیتے رہے۔ تیسرے دن فوجیوں نے سرنگ میں گھس کر کئی گلی سڑی لاشیں جو عورتوں کی تھیں وہاں سے برآمد کیں۔ کچھ کی لاپتہ رانی کی لاش بھی ملی جو برہنہ تھی۔ اجتماعی آبروریزی کی وجہ سے وہ ختم ہو گئی تھی۔ بڑا پجاری گرفتار کیا گیا اور اسے سخت سزا دی گئی۔

حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم میں دستیاب ایک ریکارڈ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دکن کی بغاوتوں کو دبانے کے سلسلہ میں اورنگ زیب نے کچھ دنوں تک وہاں قیام کیا تھا۔ اسی دوران نزدیک کے ایک گاؤں کے ایک برہمن خاندان

کے گھر سے شیولنگ کی مورتی چوری ہوگئی۔ اس برہمن کے مکان کے آس پاس رہنے والے کچھ مسلم گھرانوں پر شبہ تھا چونکہ شیولنگ کے درشن کیے بغیر وہ برہمن کچھ کھاتا پیتا نہیں تھا۔ اس لیے اس کی حالت مُردوں جیسی ہو گئی۔ اس بات کی خبر جب اورنگ زیب کو اس برہمن کی بیوی نے پہنچائی تو اس نے مقامی افسروں کو حکم دیا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر اس برہمن خاندان کو شیولنگ کی مورتی مل جانی چاہیے، ورنہ گاؤں کے سبھی لوگ سزا بھگتیں گے۔ اس ریکارڈ کے آخر میں یہ صراحت موجود ہے کہ شیولنگ کی مورتی برہمن کو مل گئی۔

بی۔ این۔ پانڈے جب الہ آباد میونسپلٹی چیرمین (۱۹۴۸-۵۲) تھے اس وقت ان کے سامنے ایک اراضی کا جھگڑا آیا۔ یہ اراضی سومیشور ناتھ مہادیو کے مندر کو دان میں ملی تھی۔ مہنت کے مرنے کے بعد اس مندر کے دو شخص دعویدار تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنے حق کے ثبوت میں کچھ کاغذات پیش کیے۔ یہ وہ کاغذات تھے جو اورنگ زیب نے دیے تھے۔ اورنگ زیب نے اراضی کا ایک بڑا حصہ اور کچھ زر نقد اس شرط پر مندر کو دان کیا تھا کہ اس سے حاصل ہونے والے آمدنی کا استعمال دیوتا کے چڑھاوے اور پوجا کے لیے کیا جائے گا۔[۴۶]

اورنگ زیب کے اراضیات وقف کرنے سے متعلق کتنے ہی فرامین ۱۶۵۹ء سے ۱۶۸۵ء کے درمیان کے ملے ہیں۔[۴۷] شمالی ہندوستان کے کچھ گردواروں سے بھی اراضیات وقف کرنے سے متعلق اورنگ زیب کے فرمان حاصل ہوئے ہیں۔[۴۸]

بنارس فرمان[۴۹] کے نام سے مشہور ایک فرمان کو پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ بنارس کے گوری محلّہ کے ساکن ایک برہمن خاندان کو یہ فرمان جاری کیا گیا تھا جس کی ساری تفصیل پہلی مرتبہ ۱۹۱۱ء میں جرنل آف دی رائل ایشیاٹک آف بنگال میں شائع ہوئی۔ ۱۰ مارچ ۱۶۵۹ء کو اورنگ زیب کے جاری کردہ اس فرمان کے مطابق ایک مسلمان، ہندو مندر کو توڑ کر اس مقام پر پارک بنانا چاہتا تھا لیکن اورنگ زیب نے اس پر روک لگادی۔

کچھ دوسرے فرمانوں[۵۰] کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب اس بات کا خواہش مند اور کوشاں تھا کہ بنارس کے ہندو امن و امان کی زندگی گزار سکیں۔ ایک خاص موقعہ پر جب مہاراجہ دھیراج راجہ رام سنگھ نے ایک درخواست اورنگ زیب کے پاس بھیجی کہ گنگا ندی کے کنارے بھگوت گوسائیں نامی دھارمک پجاری کے لیے راجہ کے باپ کے زمانہ ہی میں ایک مکان تعمیر کرایا گیا تھا لیکن اب کچھ مسلمان گوسائیں کو پریشان کر رہے ہیں، تو اورنگ زیب نے ذمہ دار افسروں کو تنبیہہ کی کہ گوسائیں کو تنگ کرنے پر وہ سزا کے مستحق ہونگے۔ اس نے یہ صلاح بھی دی کہ ہندو مذہب اور ہندوؤں کے درمیان امن و سکون کا ماحول قائم کرنے میں سارے مسلمان تعاون کریں۔

۱۹۳۴ء کے الہ آباد ہائی کورٹ کے مقدمہ کے کاغذات[۵۱] کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب مسلمانوں

کے ذریعہ کیے گئے ناجائز قبضہ کے خلاف تھا۔ بنارس کے ساکن جگ مل اور ارجن مل نے ایک درخواست اس امر کی دی کہ بنارس کے ایک مسلمان نذیر بیگ نے ان کے پانچ مکانوں پر زبردستی قبضہ کرلیا ہے۔ اس سلسلہ میں اورنگ زیب نے ۱۶۷۲ء میں ایک فرمان جاری کیا کہ اگر ارجن مل اور جگ مل کی بات صحیح ہے تو نذیر بیگ کو مکانوں میں قطعاً نہ گھسنے دیا جائے۔

آسام کی راجدھانی گوہاٹی میں واقع اوماننڈ مندر کے پجاری سداما برہمن کو اورنگ زیب نے کچھ زمین اور جنگلات کی آمدنی کا ایک حصہ دان میں دیا[۴۲]۔ اجین کے مہاکالیشور نامی مشہور شیو مندر میں جو بیس گھنٹے یعنی مسلسل چراغ جلانے کے لیے اورنگ زیب سے کئی سو سال پہلے ہی ایک بڑی اراضی اس مندر کو وقف تھی۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں کچھ مسلمان عہدیداروں نے اس پر پابندی لگائی جس کی شکایت میں اس شیو مندر کے پجاری نے اورنگ زیب کو درخواست دی۔ اورنگ زیب نے محمد مہدی جو ایک اعلیٰ افسر تھا سے جانچ کرائی اس کے بعد چار سیر گھی چبوترا کوتوال کے تحصیلدار کو اس مندر میں چراغ جلانے کیلیے دینے کا حکم دیا۔

کئی مورخین احمد آباد کے رئیس شہر کے تعمیر کرائے ہوئے چنتامنی[۴۳] مندر کو اورنگ زیب کے ذریعہ تباہ کرنے کا بیان توبڑھا چڑھا کر کرتے ہیں لیکن اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اورنگ زیب نے اسی رئیس شہر کے تعمیر شدہ شترنجیہ اور آبو مندر کو زمینیں وقف بھی کیں جس کی تفصیل اُس کاغذ میں ملتی ہے جسے جانس نے ۱۹۲۲ء میں چیف سکریٹری کو پیش کیا تھا۔

اورنگ زیب کے فرمان[۴۴] سے ہی ساہس بھائی کے لڑکے شانتی داس جوہری جو شراوک فرقہ سے تعلق رکھتا تھا کو احمد آباد میں واقع پالیتانہ کا ایک گاؤں اورنگ زیب کے ایک فرمان کے ذریعہ وقف کیا تھا۔ پالیتانہ کی پہاڑی شترنجیہ کے نام سے مشہور ہے جہاں ایک مندر ہے۔

شراوک فرقہ کے ستیا داس جوہری[۴۵] کو اورنگ زیب نے ۱۶۶۰ء میں نسار اور آبجی کی پہاڑیاں وقف کیں اُس نے اپنے ماتحت حکام کو تاکید کی کہ ان پہاڑیوں سے کوئی ٹیکس وصول نہ کیا جائے اور کسی بھی دشمن راجہ کو ان پر قبضہ نہ کرنے دیا جائے۔

کرناٹک کی فتح کے بعد ترومیتی[۴۶] کے مشہور مندر کے لیے اس نے خاص دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

- اپنے عہد حکومت کے آخری ۲۷ سال اس نے جنوبی ہندوستان میں گزارے لیکن اس مدت میں وہاں کوئی ہندو مندر برباد نہیں کیا گیا[۴۷]۔

- بنگال کے وشال پور شہر میں اورنگ زیب کے عہد میں دو مندروں کی تعمیر ۱۶۸۱ء میں ہوئی اور تیسرا مندر ۱۶۹۰ء میں تعمیر ہوا[۴۸]۔

- گجرات کے شہر سترانگ سروور کے گندے پانی کو نکال کر صاف پانی حاصل کرنے کے لیے تمام خرچ سرکاری خزانہ سے ادا کرنے کا حکم اورنگ زیب نے دیا[۴۹]

• گیا کے ایک مندر کو اس نے زمین وقف کی۔[۸۱]

مندرجہ بالا حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جن مندروں سے حکومت کو تعاون ملتا رہا اورنگ زیب نے ان کے حق میں مخلصانہ رویّہ برتا۔ لیکن ان مندروں کو اورنگ زیب نے بغیر کسی تاخیر کے فوراً روند ڈالا جن کے توسط سے ہندو راجاؤں نے اپنی خود مختاری کا مظاہرہ کرنا چاہا۔ اس نے مسلمانوں کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کرتے ہوئے گولکنڈہ کی شاہی مسجد جو مرکزی مخالف عناصر کا اڈہ بن گئی تھی تباہ کر دی بلکہ اس کے لئے اپنے باپ، بھائی اور خطرہ محسوس کرنے پر بیٹے اور بیٹی کو بھی نہیں بخشا۔ بقدر ضرورت ہندو اور مسلمان میں تفریق کئے بغیر وہ اپنے آدمیوں کی پوزیشن کو ہمیشہ مضبوط کرنے میں مصروف عمل رہا۔ ہندوؤں کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ سبھی اورنگ زیب کے مخالف نہیں تھے۔ ہندو ہو یا مسلمان مخالفین کے ساتھ یکساں سخت گیری اور ہندو مسلمان دوستوں کے ساتھ وہ فراخدلی کا نرمی کا سلوک کرتا تھا۔

مآثر عالمگیری کے مطابق اورنگ زیب نے ایک حکم کے ذریعہ محکمہ مالیات میں ہندوؤں کی تقرری بند کرا دی اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ملازمین کو چوری، سود اور رشوت خوری کی خاص عادت ہو گئی تھی۔[۸۱] ہندوؤں کی کمی ہو جانے سے سرکاری کام میں رکاوٹ آنے کے باعث اس نے اپنے حکم میں ترمیم کی اور خزانہ کے محکمہ میں تقرری کا تناسب ہندو اور مسلمانوں کے لیے پچاس، پچاس فیصد مقرر کیا۔[۸۲] ایک اہم بات کا علم اس فرمان سے یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے اجراء سے پہلے اس محکمہ میں ہندوؤں کا فی صد تناسب اور زیادہ تھا۔ عام حالات میں اورنگ زیب ہندو مسلمان میں تفریق نہ کرتا اور اہلیت کو اوّلیت دیتا تھا۔[۸۳]

اسی طرح سیاسی معاملات میں کوئی فرق کئے بغیر ہندو اور مسلمان دونوں اورنگ زیب کا ساتھ دیتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک مقامی زمیندار گوکلا کی سربراہی میں متھرا کے بیس ہزار جاٹوں نے ۱۶۶۹ء میں بغاوت کی جسے خود اورنگ زیب کو فرو کرنا پڑا اور گوکلا کو سزائے موت ہوئی۔ متھرا کے نزدیک ایک مقام نارنول میں کسانوں اور مغل سرکار کے درمیان ایک جنگ ۱۶۷۲ء میں ہوئی۔ "ودروہ ستنامی" نام کی ایک مذہبی تنظیم اس کی رہبری کر رہی تھی۔ عام طور پر کسان، دستکار، سنار، ترکھان اور بھنگی وغیرہ ستنامی کہلاتے جنھیں ذات پات میں یقین نہیں تھا۔ یہ لوگ ہندو مسلم کے فرق کو بھی نہیں مانتے تھے۔ ابتدا میں ان کی لڑائی ایک مقامی افسر سے ہوئی اور بعد میں بڑی جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ اس بغاوت کو دبانے کے لیے بادشاہ کو خود جانا پڑا۔ اس بغاوت کا ایک اہم رخ یہ ہے کہ مقامی ہندو زمینداروں نے مغلوں کا ساتھ دیا۔

راجہ رام کی سربراہی میں جاٹوں نے بھاری تیاری کے ساتھ ۱۶۸۵ء میں مغل سرکار کے خلاف بغاوت کی اور

جاٹوں کی اس بغاوت کو کچھوا ہا خاندان کے راجہ بشن سنگھ کی سربراہی میں کچلا گیا۔

اورنگ زیب انتہائی باہمت اور غیر معمولی بہادر تھا۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچ سمجھ کر اور ناپ تول کر قدم اُٹھانا اس کی فطرت تھی، پندرہ سال کی عمر میں جہاں اس نے ایک طرف بپھرے ہوئے بدمست ہاتھیوں کا تنہا سامنا کیا، وہاں دوسری طرف ۸۷ سال کی عمر میں باگن کھیڑہ" کو محصور کرنے والے مورچوں کی خندقوں میں بے خوف کھڑے رہ کر وہ اپنی جرأت اور ہمت کا مظاہرہ کرتا رہا۔ قریبی متوقع کسی مشکل گھڑی کے باوجود حوصلہ مندی کی باتیں، کھجوا اور دھرمت کی جنگوں میں موت کی بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا اس کے زندہ جاوید واقعات ہیں۔

دوسرے شہزادوں کے طور طریق کے برخلاف اورنگ زیب کتابوں کا مطالعہ کرنا پسند کرتا تھا۔ کافی باریکی سے سوچنا اس کی عادت اور سنجیدگی اس کا مزاج تھی۔ اورنگ زیب فارسی، ترکی اور ہندی زبانیں اچھی طرح بولتا اور سمجھتا۔ اسی باعث مسلمانوں کے فقہی قانون کی سب سے بڑی اور مستند کتاب فتاوٰے عالمگیری ہندوستان میں تیار ہوئی، اور اورنگ زیب کے عہد میں تیار ہوئی۔

یہ بہتر برتاؤ ہی کا نتیجہ تھا کہ شہزادگی کی عمر میں ہی اورنگ زیب نے اپنے باپ شاہجہاں کے شاہی دربار کے سربرآوردہ امیروں کو دوست بنا لیا تھا۔ اس نے اپنی اس عادت کو بادشاہ بننے کے بعد اور بھی دوچند کیا۔ رعایا نے اسے شاہی پوشاک میں ایک درویش کہا۔ سادہ اور بااصول زندگی گزاری اور لہو و لعب سے یکسر دور رہا۔ اس کی ازواج کی تعداد قرآن کی مقرر کردہ چار کی حد سے ہمیشہ کم رہی۔ ۱۶۵۷ء میں دل رس بانو مرگئی۔ ۱۶۶۰ء کے بعد نواب بائی کو تنہائی کی زندگی گزارنی پڑی۔ اورنگ آبادی کا انتقال ۱۶۸۵ء میں ہوا اس سے پہلے وہ ہمیشہ اورنگ زیب کے ساتھ رہی۔ ۱۶۶۰ء میں اورنگ زیب کی شادی اودے پوری کے ساتھ ہوئی اور اس کے آخری ایام میں وہی اورنگ زیب کے ساتھ رہی۔

نظام سلطنت کی دیکھ ریکھ کیلئے وہ حیران کن جدّو جہد کرتا تھا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ کبھی کبھی دن میں دو مرتبہ دربار منعقد کر لیتا۔ اورنگ زیب کے آخری ایام کے اطالوی درباری معالج گیملی کے مطابق "اورنگ زیب کا قد پستہ، ناک لمبی، جسم چھریرا اور ضعیفی کے سبب خمیدہ تھا۔ اس کا رنگ گیہواں اور سفید گول داڑھی تھی۔ مختلف معاملات کے سلسلہ میں پیش کی جانے والی عرضیوں پر ضروری احکامات اسے خود اپنے ہاتھ سے لکھتے دیکھ کر میرے دل میں اس کے لیے انتہائی احترام کا جذبہ عود کر آتا۔ لکھتے پڑھتے وقت وہ چشمہ نہیں لگاتا تھا۔ اس کے بشاش چہرے کو دیکھ کر محسوس ہوتا کہ اسے اپنا کام بہت ہی عزیز ہے۔ ۹۰[۸۵] سال کی عمر میں بھی اس کے حواس اور اعضا پوری طرح فعال تھے۔

اس کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ جس کسی کو ایک بار دیکھ لیتا یا ایک مرتبہ کسی بات کو سن لیتا اسے وہ زندگی بھر نہیں بھولتا۔ پچھلے چند سال سے بوجہ ضعیفی وہ کچھ اونچا سننے لگا تھا۔ ایک حادثہ میں اُکھڑے ہوئے داہنے گھٹنے کا علاج صحیح طور پر نہ ہونے کی وجہ سے وہ کچھ لنگ کرنے لگا تھا۔ ان دو جسمانی خامیوں کے باوجود تادم حیات اس کی تمام جسمانی قوتیں فعال و برقرار ہیں[۸۲]۔ اورنگ زیب نے صوفیا کی طرح ریاضت کی زندگی کو پسند کیا اور ہمیشہ انکساری کا مظاہرہ کیا۔ اسے "عالمگیر زندہ پیر" کہا جاتا[۸۳]۔

باب ۔ ۳

مرکز سے مخالفت

راجپوتوں کے لیے پالیسی

اپنے اجداد کے مانند اورنگ زیب نے بھی راجپوتوں کے ساتھ بہتر تعلق قائم رکھنے کی کوشش کی۔ میوات کے مہارانا کا منصب پانچ ہزاری سے بڑھا کر چھ ہزاری کر دیا۔ راجہ جسونت سنگھ جس نے اورنگ زیب کے خلاف لڑائی میں شجاع کا ساتھ دیا اور دارا شکوہ کو اورنگ زیب کے بر خلاف اپنی مملکت میں آنے کی دعوت دی اسے اس کا منصب بحال کیا اور گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا۔ ۱۶۷۸ء میں جسونت سنگھ کا انتقال ہو گیا۔ دستور سے ہٹ کر اورنگ زیب نے مارواڑ کے دو پرگنے جسونت سنگھ کے اہل و عیال اور اس کے بہی خواہوں کے خرچ کے لیے دیے۔

جسونت سنگھ کی مہارانی "رانی ہادی" کو جودھپور پر مغلوں کا تسلط تسلیم نہیں تھا اور جودھپور کو وہ راٹھوروں کی مادرِ وطن کہتی تھی۔ اس لیے اورنگ زیب کی سپاہ اور امداد قبول نہیں کی۔ اورنگ زیب کو یہ بات ناگوار ہوئی اور اقتصادی طور پر کمزور کرنے کے لیے اس نے جسونت سنگھ کے خزانہ کی تلاش شروع کر دی اس وقت ہندو راجہ اپنی دولت مندروں میں چھپا کر رکھتے تھے لہٰذا مغل فوج کو یہ اجازت دی گئی کہ دولت کی تلاش میں وہ مندر گرا دیں یا انھیں بند کر دیں[۲]۔

جسونت سنگھ[۳] کے انتقال کے بعد اس کی دو رانیوں نے ایک ایک لڑکے کو جنم دیا تو جانشینی کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس زمانہ کا دستور یہ تھا کہ کوئی جانشین نہ ہونے کی صورت میں اس راجہ کی ریاست مرکز کے تحت میں چلی جاتی۔ دونوں بچے چونکہ نابالغ تھے اس لیے اورنگ زیب نے جودھپور سے ٹیکس وصول کرنے کا ٹھیکہ جسونت سنگھ کے

بڑے بھائی کے پوتے اندر سنگھ کو ۲ لاکھ روپیہ لے کر دیدیا۔ جسونت سنگھ کے بیٹے اجیت سنگھ کو منصب اور ریاست مارواڑ کے دو پرگنے سوجت اور جیتا کھ بطور جاگیر اورنگ زیب نے دیدیے تاکہ مرہٹوں یا سکھوں سے مل کر یہاں کے راجپوت مرکز کے مخالف نہ ہو جائیں۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اورنگ زیب نے مارواڑ کے راجہ کے خاندان کو آپس میں تقسیم کرنا چاہا تھا لیکن راٹھور سرداروں کے رہنما درگا داس نے اجیت سنگھ کے سلسلہ میں کیے گئے اورنگ زیب کے فیصلہ کو تسلیم نہیں کیا۔ جب راجکماروں اور ان کی ماؤں کو قید کرنے کا حکم اورنگ زیب نے دیا تو درگا داس ٹھنڈا ہو گیا۔ جودھپور کی گدی پر اجیت سنگھ بیٹھا۔ کچھ ہی عرصہ میں اورنگ زیب مارواڑ کے راٹھوروں سے نامطمئن ہو گیا اور ان پر دھاوا بول دیا۔ اس کے حملہ سے ڈر کر بھاگتے ہوئے درگا داس اور اجیت سنگھ نے میواڑ کے رانا راج سنگھ کے یہاں پناہ لی۔ دشمن کے دوست کو دشمن سمجھتے ہوئے اورنگ زیب نے میواڑ پر حملہ کر دیا۔ رانا نے بھاگ کر پہاڑی علاقوں میں جان بچائی اور مغلوں کے خلاف پھر تیاری میں مصروف ہو گیا۔

اورنگ زیب کے باغی بیٹے اکبر کو درگا داس نے تحفظ اور سرپرستی دی تو اکبر نے اجمیر پر چڑھائی کر دی۔ میواڑ پر حملہ اور اکبر کی بغاوت سے نمٹنے کے لیے اورنگ زیب نے سخت پالیسی اپنائی۔ اکبر مہاراشٹر کی جانب بھاگ گیا۔ رانا راج سنگھ کے بیٹے رانا جگت سنگھ سے مل کر کے اسے پنج ہزاری کا منصب عطا کیا اور جگت سنگھ نے اجیت سنگھ کا ساتھ نہ دینے کا وعدہ کیا۔

راجپوتوں کو غیر مطمئن سمجھتے ہوئے اورنگ زیب نے اجیت سنگھ کو مارواڑ کا حکمراں تسلیم کر لیا لیکن تناؤ پھر بھی قائم رہا۔

مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر اورنگ زیب راجپوتوں کو شک کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ اورنگ زیب کے دورِ حکومت کے ابتدائی بیس سال میں اس کی راجپوت دشمنی کے شواہد نہیں ملتے۔ شاہجہاں کے عہد میں یک ہزاری اور اس سے اوپر کے منصب پانے والے راجپوتوں کا فیصد اوسط محض ۱۶ تھا۔ شاہجہاں نے کسی بھی راجپوت کو ہفت ہزاری کا منصب عطا نہیں کیا۔ لیکن اورنگ زیب نے جے سنگھ اور جسونت سنگھ کو ہفت ہزاری کا منصب عطا کیا۔ کچھواہا، ہاڑا بھاٹی اور بیکانیر کے راٹھور اورنگ زیب کے مطیع رہے۔

مغل افواج میں ہندوؤں کی تعداد کی تقابلی فہرست[۶]

منصب	اکبر	جہانگیر	شاہ جہاں	اورنگ زیب
۷ ہزاری	۱	–	–	۲
۶ ہزاری		۱	۱	۴
۵ ہزاری	۵	۹	۹	۵
۴ ہزاری	۴	۴	۱۰	۵
۳½ ہزاری	۱	۱	–	۴
۳ ہزاری	۳	۵	۲۴	۱۳
۲½ ہزاری	–	۳	۵	۵
۲ ہزاری	۸	۱۲	۲۲	۱۶
۱½ ہزاری	۵	۵	۲۱	۲۷
ایک ہزاری	۸	۴	۳۳	۱۵
۹ سو	–	۱	۲	۱
۸ سو	–	۲	۲۰	–
۷ سو	۴	–	۱۵	۳
۶ سو	–	۱	۱۱	۲
۵ سو	۷	۵	۴۴	۲
کل میزان	۴۶	۵۵	۲۲۷	۱۰۴

۵ سو سے ۷ ہزاری منصب کے درجہ کے منصب داروں کی فہرست جس کی تفصیل معاصر مورخین اور دوسرے دانشوروں نے پیش کی ہے۔

عہد شاہی	فرقہ	تذکرہ ابوالفضل	تذکرہ ڈیلیٹ	تذکرہ کیول رام	تذکرہ لاہوری	میزان
اکبر	مسلم	۲۱۵		۲۱۴		۲۴۷
	ہندو	۲۲		۲۷		
جہانگیر	مسلم		۳۸۳			۴۳۸
	ہندو		۵۵	۵۵		
شاہجہاں	مسلم			۴۳۷	۴۵۳	۶۶۴
	ہندو			۲۲۷	۱۱۰	
اورنگ زیب	مسلم			۴۲۵	۴۲۵	۵۲۹
	ہندو			۱۰۴	۱۰۴	

افغان

اورنگ زیب کا ٹکراؤ افغانوں یا پٹھانوں سے بھی ہوا۔ یہ لوگ بنجاب اور کابل کے درمیان پہاڑی علاقوں میں اپنی بہادری کے بل پر آباد تھے۔ ان کے خلاف اکبر اور شاہجہاں کو جنگ کرنا پڑی تھی بھوک کی آگ بجھانے کے لیے قافلوں کو لوٹنے یا مغل فوج میں بھرتی ہونے کے علاوہ حصول معاش کا اور کوئی ذریعہ ان افغانوں کے پاس نہیں تھا۔ یہ لوگ آزاد ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ زیادہ مشاہرہ اور دیگر امداد دے کر مغل حکمراں انھیں راضی رکھتے لیکن کسی بھی خود غرض رہنما کے اُبھرنے سے اس تعلق کے کٹ جانے کا خطرہ لگا رہتا۔

افغان بغاوت کی ایک انوکھی شکل اورنگ زیب کے عہد میں رونما ہوئی۔ ۱۶۶۷ء میں ایک افغان سردار بھاگو نے خود کو وزیر اور قدیم شاہی خاندان کا فرد ہونے کا دعویٰ کرنے والے محمد شاہ کو راجہ مشہور کیا اور جاٹوں کی طرح خود مختار ریاست کا اعلان کر دیا۔ بھاگو سردار کے سپاہ نے ہزارہ، اٹک اور پشاور میں لوٹ مار شروع کی خیبر کے راستے سے آمد و رفت بند ہو گئی۔

افغانوں کی اس کوشش کو ناکام بنانے کے لئے اورنگ زیب نے اپنے مخصوص بخشی امیر خاں کو بھیجا اور اس کی مدد کے لیے راجپوت سپاہیوں کے ایک دستہ کو منظم کیا۔ کئی خوفناک جنگوں کے بعد افغانوں کی اس بغاوت کو دبا دیا

گیا۔ اس علاقہ کی نگہداشت کے لیے ۱۶۷۱ء میں مارواڑ کے حاکم جسونت سنگھ کو جمرود کا افسر مقرر کیا گیا۔

افغانوں نے ۱۶۷۲ء میں دوبارہ بغاوت کی۔ ایک آفریدی سردار اکمل خاں جس نے اپنے راجہ ہونے کا اعلان کر کے سکہ چلایا، اس بغاوت میں افغانوں کا سرغنہ تھا۔

تمام افغانوں کو ایک ساتھ مل کر مغلوں کو زیر کرنے کا اس نے نعرہ دیا۔ افغانوں کی بڑی تعداد نے مل کر درّہ خیبر کو بند کر دیا۔ ایک تنگ گھاٹی کو صاف کرنے کے لیے اکمل خاں اتنا اندر چلا گیا کہ مغل فوج سے سامنا ہو گیا لیکن کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ دس ہزار افغان ہلاک ہوئے اور بہت سے افغان قبیلے باغیوں کی سپاہ میں شامل ہو گئے۔

مغل سردار شجاعت خاں کو بھی خیبر میں کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ جسونت سنگھ کے بھیجے ہوئے راجپوت بہادروں کی مدد سے شجاعت خاں بدقت اپنی جان بچا سکا۔ ۱۶۷۴ء میں اورنگ زیب کو خود پشاور جانا پڑا اور تقریباً ڈیڑھ سال تک وہاں ٹھہرے رہنا پڑا۔ جب تک افغانوں میں اتحاد قائم رہا ان پر قابو پانا دشوار رہا۔ آخر میں اورنگ زیب نے اپنی حکمت عملی اور حسب ضرورت طاقت استعمال کر کے افغانوں کا اتحاد ختم کر دیا تب کہیں امن کی صورت نظر آئی۔

مرکز سے بغاوت کرنے کی وجہ سے انھیں کچلا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر غیر مسلموں کے علاوہ بھی ہونے والی کسی بغاوت کو دبانے اور کچلنے سے اورنگ زیب نے گریز نہیں کیا۔

مذکورہ بالا حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ مرکز کو کمزور کرنے والی کوئی بھی طاقت خواہ ہندو ہو یا مسلمان دونوں کو یکساں طور پر سختی کے ساتھ کچل دیا جاتا تھا، جیسا کہ افغانوں کے ساتھ ہوا۔

سکھ بغاوت

سکھوں کی بغاوت اورنگ زیب کے خلاف آخری بغاوت تھی۔ حکمرانوں کے مانند سکھ گروؤں نے اپنا رہن سہن وضع کر لیا تھا اور فوج کو بھی ترتیب دے لیا تھا۔ خود کو "سچا بادشاہ" کہتے۔ ۱۶۷۵ء تک مرکز کے لیے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہ کرتے ہوئے اورنگ زیب نے سکھ گروؤں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

ساتویں گرو ہر رائے[9] کا پہلا لڑکا رام رائے تھا جو ایک باندی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ ہر رائے کی بیاہتا بیوی کے بطن سے ایک دوسرے لڑکے ہرکشن کی پیدائش ہوئی۔ ہر رائے نے اپنی باندی کے لڑکے رام رائے کو اپنا جانشین ہونے کا اعلان کیا جس کی وجہ سے پنجاب میں آپسی تنازعہ کافی بڑھ گیا۔ اس تنازعہ کو طے کرنے کی ذمہ داری

اورنگ زیب کے سپرد کی گئی لیکن سکھوں کی اس بحث میں وہ پڑنا نہیں چاہتا تھا کہ سکھ خود ہی اس کا فیصلہ کرلیں[10]۔

بالآخر ہر رائے کی بیاہتا بیوی سے پیدا ہونے والا لڑکا ہرکشن آٹھویں گرو بنے لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد چیچک کی بیماری سے ان کی موت ہو گئی اور تیغ بہادر کو نواں گرو بنایا گیا۔ گرو تیغ بہادر نے آسام سے ہونے والی لڑائی میں مغلوں کی فوج کی طرف سے حصہ لیا۔ بعد میں اپنے چیلوں اور سپاہیوں کا خرچ چلانے کے لیے زور اور جبر[11] کے ساتھ دولت حاصل کرنا شروع کر دی۔ آدم حافظ نامی ایک صوفی سے گرو تیغ بہادر کی گہری دوستی تھی۔ دولت مند ہندوؤں سے تیغ بہادر اور مالدار مسلمانوں سے آدم حافظ من چاہی دولت وصول کرتے[12]۔ دونوں کی دہشت گردی سے تنگ آکر اورنگ زیب کے فوجیوں نے دونوں کو قید کر لیا۔ حقیقت میں ذاتی عیش و آرام کی خاطر آدم حافظ نے غیر قانونی کام کیا۔ اس لئے اورنگ زیب نے اسے ملک بدر ہو جانے کی سزا دی۔ مرکز کے خلاف اپنی فوجی حالت مضبوط کرنے کے لیے چونکہ گرو تیغ بہادر نے خوف و ہراس پھیلایا تھا لہٰذا ۱۶۷۵ء میں اورنگ زیب کے حکم پر انھیں سزائے موت دی گئی۔ لیکن گرو تیغ بہادر کو سزائے موت دیے جانے کے سلسلہ میں ہمارے پاس ٹھوس ثبوت کی کمی ہے[13]۔

ایک انگریز آفیسر میکلف نے اپنی کتاب "سکھوں کی تواریخ" میں سب سے پہلے یہ تحریر کیا ہے کہ اورنگ زیب نے گرو تیغ بہادر کو سزائے موت دی۔ میکلف سے پہلے اس کا کوئی تذکرہ یا ثبوت نہیں ملتا۔ اس سے بھی اہم ایک نکتہ یہ ہے کہ میکلف کے بعد شائع ہونے والی دوسری کتاب میں میکلف کے اس خیال کو کہ "اورنگ زیب نے گرو تیغ بہادر کو موت کی سزا دی" کافی اہمیت دی گئی جبکہ میکلف سے پہلے ایک دوسری بات کا علم ہوتا ہے[14]۔ بھائی منی سنگھ کی ۱۸۹۲ء میں شایع ہوئی کتاب "بھگت رتناولی" میں واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ ایک سکھ نے ہی ان کی اپنی اجازت سے ان کا سر کاٹ دیا۔ کننگھم[15] نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب کو اپنی کرامت دکھانے کے لیے انھوں نے کہا کہ وہ ایک ایسا منتر لکھیں گے کہ جو بھی اسے اپنی گردن میں باندھے گا، تلوار کے بھاری سے بھاری وار کا بھی کوئی اثر اس کی گردن پر نہیں ہوگا۔ اس منتر کو انھوں نے خود اپنی ہی گردن میں باندھا اور اپنے چیلے کو وار کرنے کا اشارہ کیا۔ تلوار کی بھاری ضرب جیسے ہی ان کی گردن پر پڑی سرتن سے جدا ہو کر ایک طرف جا گرا۔ اس واقعہ کے راوی وہ لوگ ہیں جنھیں گرو جی کی خدمت میں ہمیشہ حاضر رہنے کی سعادت حاصل تھی۔ ۱۹۱۲ء میں یہ کتاب بھگت رتناولی جب دوبارہ شائع ہوئی تو مذکورہ بالا واقعہ کو حذف کر دیا گیا کیونکہ اس سے پہلے میکلف کی کہانی آچکی تھی۔

گیانی سنگھ کی تصنیف پنتھ پرکاش کا پہلا ایڈیشن ۱۸۷۹ء اور دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا۔

اس کتاب کے دونوں ایڈیشنوں میں اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ گرو تیغ بہادر کو اورنگ زیب نے قتل کرایا۔ پنتھ پرکاش کا تیسرا ایڈیشن مالکم کی کتاب کے بعد شائع ہوا۔ اس کتاب میں یہ عبارت ہے کہ گرو جی سے اسلام قبول کرنے کو کہا گیا۔ ان کے انکار پر دہلی کے چاندنی چوک پر برسرعام ان کا قتل کر دیا تھا۔ ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ کننگھم نے اپنی کتاب میں اس واقعہ کو تحریر نہیں کیا۔

"سکھاں دے راج" کتاب ۱۸۶۲ء اور ۱۸۹۲ء میں دو مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بھی بھگت رتناولی کی طرح گرو تیغ بہادر کو اورنگ زیب کے ذریعہ سزائے موت دیے جانے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے لیکن اس کتاب کے گورمکھی ایڈیشن میں اصلیت کے برخلاف اورنگ زیب کا نام اور یہ واقعہ شامل کر دیا گیا۔

گرو تیغ بہادر کی موت کے بعد سکھ تحریک نے فوجی نوعیت اختیار کر لی۔ اس تحریک کو سکھوں کے دسویں اور آخری گرو گوبند سنگھ کا خصوصی تعاون حاصل رہا۔ پہلے مرحلہ میں ہندو راجاؤں نے آپسی جھگڑوں میں گرو گوبند سنگھ کی مدد سے فائدہ اٹھانا چاہا لیکن گرو جی بہت جلد اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے بعد ہندو راجاؤں کے مخالف ہو گئے۔ کئی ہندو راجاؤں نے ایک ساتھ مل کر ۱۷۰۴ء میں گرو جی پر حملہ کر دیا جس میں گرو جی کو فتح ہوئی۔ تب ہندو راجاؤں نے مغلوں سے گرو گوبند سنگھ کے خلاف مدد کرنے کی درخواست کی۔ مغل طاقت نے گرو گوبند سنگھ کو زیر کرنا اپنی اغراض کے پیش نظر ضروری سمجھا۔ اورنگ زیب نے لاہور کے صوبہ دار اور سرہند کے فوجدار وزیر خاں کو گرو گوبند سنگھ کے خلاف پہاڑی راجاؤں کی مدد کرنے کا حکم دیا اور سکھ ہٹائے گئے۔

اورنگ زیب کو ظالم اور سکھوں کا مخالف ثابت کرنے کے لیے تاریخی شواہد کے ساتھ ۱۸۲۷ء کی مطبوعہ ایک کتاب میں مذکور ہے کہ اورنگ زیب نے گرو گوبند سنگھ کے دو بچوں کو مار ڈالا۔ بھائی بیر سنگھ پٹیالوی نے اپنی کتاب "سنگھ ساگر" میں گرو گوبند سنگھ کے دونوں بچوں کو دیوار میں چن کر مار دینے کا تذکرہ سب سے پہلے کیا ہے۔[۱۱] براؤن کننگھم[۱۲] وغیرہ نے بعد میں اس قصّہ کو اور نمک مرچ لگا کر پیش کیا۔ ۱۸۸۷ء سے گرو جی کے دونوں بچوں کے نام پر میلہ بھی لگنا شروع ہو گیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ گرو گوبند سنگھ کے اہم منصوبوں اور مرکز مخالف تحریکات سے اورنگ زیب چوکنّا ہو گیا تھا، اور دیگر مرکز سے بغاوت کرنے والوں کی طرح اس نے سکھوں کو بھی کچلا لیکن اس بات کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے

کہ گوبند سنگھ کے دو بچوں کو اس نے مروا دیا۔[18] گرو گوبند سنگھ کی موت ایک پٹھان کے ہاتھوں ہوئی جس کے دو بیٹوں کو گرو جی نے مار ڈالا تھا۔ گرو گوبند سنگھ سے مل کر اورنگ زیب حالات کو معمول پر لانے کا خواہش مند تھا لیکن اس سے پہلے ہی ۱۷۰۷ء[19] میں اس کا انتقال ہو گیا۔[20]

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلے یا تناؤ کو صد فیصد درست بتانا سیاسی مفاد کے پیش نظر مناسب ہو سکتا ہے لیکن تاریخی نقطۂ نظر سے نہیں۔ ہمیں بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ دشمنی یا ذاتی مفاد کے پیشِ نظر ہندوؤں کے خلاف ہندوؤں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا[21] اور اس بات کے بھی ثبوت موجود ہیں کہ حسب ضرورت مسلمانوں نے مسلمانوں کی مخالفت یا ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ مثال کے طور پر گنگارام برہمن جس کے یہاں گرو گوبند سنگھ کی ماں سندری اور ان کے بچوں نے پناہ لی۔ اسی گنگارام نے ان بچوں اور گرو جی کی ماں سندری کو سرہند کے حاکم کے حوالہ کر دیا۔ اور جان کی بازی لگا کر گرو گوبند سنگھ کو موت سے بچانے والے بنی خاں اور غنی خاں دونوں کو گرو گوبند سنگھ نے "بیٹوں سے بھی پیارے" کہا۔

گرو ارجن سنگھ کا بھائی پرتھوی چند تھا۔ اس نے جب تک بھائی کی جان نہ لے لی چین سے نہیں بیٹھا۔ حالانکہ اسی کی وجہ سے گرو ارجن کو گرفتار کیا گیا تھا۔

میاں میر بھی ایک مسلمان تھا جس کے ہاتھوں امرتسر کے گرودوارہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔

چندو شاہ ایک ہندو ہی تھا جس نے کافی اذیتیں دے کر گرو ارجن سنگھ کو مارا اور ان کے بھائی پرتھوی چند کا دل ٹھنڈا کیا۔ بابا فریدؒ وہ مسلمان تھے جن کی نظموں کو گرو ارجن سنگھ نے گرو گرنتھ صاحب میں شامل کیا۔ بہادر شاہ گو مسلمان تھا لیکن اس کی دی ہوئی (تلوار) ذوالفقار آج بھی آنند پور صاحب میں موجود ہے۔ دھیر مل گرو تیغ بہادر کا بھتیجہ تھا جو ہمیشہ ان کے خلاف مغل دربار کے کان بھرتا رہتا تھا۔ چنانچہ یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں کی بغاوتیں ہوئیں لیکن کسی طرح کا فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔[22]

بیجاپور

بیجاپور کے نواب عادل شاہ نے مغلوں سے ہر معاہدہ توڑنے کے لیے کیا اور اورنگ زیب سے اس کی کشیدگی بڑھتی گئی۔ ایک اہل اور باصلاحیت نواب نہ ہونے کی وجہ سے عادل شاہ کی بدولت بیجاپور کی اندرونی صورت حال بگڑتی گئی۔ ذاتی مفاد کی خاطر مرہٹوں نے بیجاپور کو مدد دی لیکن مرہٹوں سے بھی بیجاپور کے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ تعلقات ختم ہو گئے۔ اس صورت میں بیجاپور نے مغلوں سے دوبارہ مدد کی درخواست کی۔ مغلوں سے مدد لینے کے بعد

بیجاپور کا حکمراں پھر مغلوں کا مخالف ہو گیا۔ عادل شاہ کے بعد یکے بعد دیگرے دوسرے بیجاپوری سرداروں نے بیجاپور کا استعمال کیا۔ وہاں کی گدی کے سرپرست مسعود نے مغلوں کے خلاف مرہٹوں سے مدد مانگی چنانچہ دس ہزار گھوڑ سوار مرہٹے اور دو ہزار بیلوں پر سامانِ خورد و نوش لاد کر شیواجی نے بھجوا دیا۔ بعد میں سپاہ کے ساتھ شیواجی بھی بیجاپور پہنچ گیا۔

مغل سردار دلیر خاں بیجاپور کے نواحی علاقوں کو فتح کرتا ہوا بیجاپور کے قلعہ تک جا پہنچا اور اسے فتح کرنے کے لیے تقریباً دو ماہ تک پڑاؤ ڈالے رہا لیکن کامیابی نہیں ہوئی بالآخر وہ واپس چلا گیا۔ ۱۶۸۲ء میں شہزادہ اعظم کی سربراہی میں ایک بڑی فوج بھیجی گئی۔ بیجاپور کا مغل فوجوں نے محاصرہ کر لیا چنانچہ ۱۲ ستمبر ۱۶۸۶ء کو بیجاپور مغلوں کے تحت میں آ گیا۔

گول کنڈہ

ابنا دو سرا نشانہ اورنگ زیب نے گول کنڈہ کو بنایا۔ وہاں کا چھٹا سلطان عبداللہ قطب شاہ ۲۱ اپریل ۱۶۷۲ء کو فوت ہو گیا۔ اس کی تین لڑکیاں تھیں لیکن لڑکا کوئی نہیں تھا۔ اس کا تیسرا داماد ابوالحسن تھا۔

عبداللہ کے مرتے ہی ریاست گول کنڈہ کے لیے جانشینی کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ ایرانی نایک سید محمد کی مدد سے ابوالحسن سلطان اور مظفر وزیر اعظم بنا۔ مظفر کا قتل کر دیا گیا تو اور مدنا نامی برہمن کو ابوالحسن نے وزیر بنایا۔ مدنا کا بھائی اکنا گول کنڈہ کا سپہ سالار اعظم مقرر ہوا۔ چونکہ ابوالحسن دن رات عیاشی اور راگ رنگ میں مشغول رہتا تھا اس لیے اصل طاقت مدنا کے ہاتھ آ گئی۔ اپنی حیثیت محفوظ رکھنے کے لیے اس نے مرہٹوں کو ایک لاکھ ہن سالانہ دے کر تحفظ حاصل کیا۔

بیجاپور کو فتح کرنے میں مغلوں کو جن دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کے لیے مرہٹوں کے مقابلہ گول کنڈہ بھی کچھ کم قصوروار نہیں تھا۔ شہزادہ شاہ عالم کی سربراہی (کمان) میں حیدرآباد پر حملہ کرنے کے لیے اورنگ زیب نے فوج روانہ کی۔ ۱۸ اکتوبر ۱۶۸۵ء کو ابوالحسن نے ہتھیار ڈال دیے اور دونوں کے درمیان کچھ شرائط پر صلح ہو گئی۔ لیکن گول کنڈہ کی نقل و حرکت مغلوں کے خلاف جاری رہی۔ ۷ فروری ۱۶۸۷ء کو اورنگ زیب نے گول کنڈہ کی گھیرابندی کرا دی اور قلعہ کی دیوار توڑ کر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اسی دوران مغلوں کو قحط اور مرہٹوں کا سامنا کرنا پڑا اس کے باوجود مغل فوجیں آٹھ ماہ تک محاصرہ کیے رہیں۔ ۲۱ ستمبر ۱۶۸۷ء کو گول کنڈہ کے قلعہ پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا اور ابوالحسن قید کر دیا گیا۔

گول کنڈہ کو فتح کرنے پر وہاں کے قلعہ سے سونے چاندی کے برتن، جواہرات اور زیورات کے علاوہ سات

کروڑ روپیہ نقد بھی مغلوں کو حاصل ہوئے۔ مغلوں کی اس مفتوحہ ریاست کی آمدنی دو کروڑ ستاسی لاکھ روپیہ تھی۔

مراٹھا

بیجاپور اور گول کنڈہ کے زوال کے بعد اورنگ زیب نے اپنی تمام تر طاقت مرہٹوں کے خلاف لگادی۔

برہان پور اور اورنگ آباد پر حملوں کے علاوہ ایک نے مرہٹہ سردار سنبھا جی نے اورنگ زیب کے باغی بیٹے شہزادہ اکبر کو پناہ دے کر اورنگ زیب کو ایک بڑا چیلنج دیا تھا۔ اورنگ زیب کو اس بات کا بڑا اندیشہ تھا کہ مرہٹوں کی حمایت کے سہارے مغل علاقوں میں شہزادہ اکبر نے اگر حملے شروع کر دیے تو ایک طویل خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔

لیکن سنبھا جی نے شہزادہ اکبر کو بھرپور سہارا نہ دے کر اپنی طاقت پرتگیزیوں اور سدّیوں کے خلاف بے مقصد کی لڑائی میں لگا دی۔ شہزادہ اکبر اور سنبھا جی کا ساتھ مشتبہ ہونا فطری بات ہے۔ چونکہ جب اورنگ زیب بیجاپور اور گول کنڈہ کے خلاف جنگ میں مصروف تھا اس وقت بھی سنبھا جی نے شہزادہ اکبر کو وافر امداد دینے سے انکار کر دیا تھا محض اسی وجہ سے ۱۶۸۶ء میں مغل علاقوں پر شہزادہ اکبر کے حملوں کو باآسانی ناکام بنایا جاسکا۔ ناامید ہو کر شہزادہ اکبر سمندر کے راستہ فرار ہو کر ایران چلا گیا۔

بیجاپور اور گول کنڈہ کے زوال کے بعد بھی سمبھا جی اپنے نواح میں اور اپنے داخلی حریفوں سے نمٹنے میں مصروف رہا۔ ۱۶۸۹ء میں اپنے ایک خفیہ اڈّے سنگ میشور پر اچانک مغلوں کے حملہ سے سمبھا جی حیران رہ گیا۔ اسے اورنگ زیب کے سامنے لایا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ مراٹھوں سے سمجھوتا کر کے اورنگ زیب بیجاپور اور گول کنڈہ پر اپنی فتح کو مستقل کر سکتا تھا۔ سمبھا جی کو قتل کر کے اس نے نہ صرف اس موقعہ کو کھو دیا بلکہ مرہٹوں کو اپنا محاربہ مزید تیز کرنے کا بہانہ فراہم کر دیا۔ کسی ایک طاقتور رہنما کے نہ ہونے کی وجہ سے مرہٹہ سرداروں نے کھلے عام مغل علاقوں میں لوٹ مار شروع کر دی مغل فوج کو دیکھتے ہی وہ اِدھر اُدھر چھپ جاتے تھے۔ مرہٹوں کا خاتمہ کرنے کے بجائے اورنگ زیب نے انھیں سارے دکن میں اپنی حرکات وسکنات مزید تیز کرنے کا موقع دیا۔ سمبھا جی کے چھوٹے بھائی راجہ رام کی حکومت تو قائم ہوئی لیکن راجدھانی پر مغلوں کا حملہ ہوتے دیکھ کر وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ راجہ رام نے بھاگ کر مشرقی سرحد پر جنجی میں پناہ لی اور وہاں سے اس نے مغلوں کے خلاف جنگ کو جاری رکھا اس طرح مرہٹوں کی بغاوت مغرب تا مشرق پھیل گئی۔

اورنگ زیب نے جنجی میں راجہ رام کو محاصرہ میں لے لیا یہ محاصرہ کافی دن تک جاری رہا۔ ۱۶۹۸ء میں جنجی کا زوال ہوا لیکن راجہ رام وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ مرہٹوں کے حملوں میں تیزی آگئی۔ کئی مرتبہ مغلوں کو کثیر نقصان اٹھانا

پڑا۔ مرہٹوں نے کھوئے ہوئے کئی قلعوں پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ راجہ رام ستارا واپس آنے میں کامیاب ہوا۔ مغلوں اور مرہٹوں کی کشیدگی برقرار رہی۔

۱۷۰۳ء میں اورنگ زیب نے مرہٹوں سے بات چیت شروع کی' سمبھاجی کے لڑکے ساہو کو وہ رہا کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ اس وقت ساہو ستارا میں اپنی ماں کے ساتھ قید تھا۔ ساہو کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا۔ جوان ہونے پر اس کی شادی نامور مرہٹہ گھرانوں کی دو لڑکیوں کے ساتھ کر دی گئی' شیواجی کی ریاست اور دکن میں "سر دیش مکھی" کا اختیار ساہو کو دے کر اس کی خصوصی حیثیت تسلیم کرنے کے لیے اورنگ زیب تیار تھا۔ لیکن خفیہ معلومات کی بنا پر اورنگ زیب نے آخر میں مرہٹوں سے مشتبہ ہو کر اس سارے منصوبہ کو ردّ کر دیا۔

۱۷۰۶ء میں اورنگ زیب کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ مرہٹوں کے تمام قلعوں پر قبضہ کرنا مشکل ہے لیکن پھر بھی جنگ جاری رہی۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوگیا اور مرہٹوں کو دم لینے کا موقع مل گیا۔

اگر ہم اورنگ زیب کو ایک مسلم حکمراں کے بجائے صرف حکمراں یا بادشاہ سمجھیں تو یہ حقیقت تسلیم کرنا ہوگی کہ کسی بادشاہ کو ہر چیز سے زیادہ اپنے تاج و تخت کی بقا اور استحکام عزیز ہوتا ہے۔ چنانچہ اورنگ زیب نے بھی اپنی سلطنت اور تخت کے استحکام کو ہی اولیت دی۔ اس کی صوبائی حکمت عملی اور ان کی تشکیل میں یہی مقصد سب سے زیادہ اہم اور نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے دکن کی کتنی ہی ریاستوں کے مسلم حکمرانوں اور اعلیٰ عہدیداروں کو جہاں ایک طرف اپنا مخالف سمجھا وہیں دوسری طرف ہندوؤں کو اپنا معتمد سمجھا۔ ایک طاقتور راجپوت جے سنگھ کو نہ صرف صوبہ داری کے اعلیٰ عہدہ پر فائز کیا بلکہ اس پر اعتماد کرتے ہوئے مرہٹوں سے نمٹنے اور ان کی طاقت کو ختم کرنے کی پوری ذمہ داری بھی اسی کے سپرد کی۔ مسلم اور غیر مسلم پر دھیان دیے بغیر جے سنگھ نے بھی ایمانداری اور پوری وفاداری کے ساتھ مرہٹوں کی مخالفت اور اورنگ زیب کی حمایت میں اہم کارکردگی دکھائی۔

جس طرح ذاتی مفادات کے تحت گولکنڈہ اور بیجاپور کے مسلمانوں نے اورنگ زیب کی مخالفت' اس کے کنبہ میں نااتفاقی اور ہندو طاقتوں کے ساتھ راہ و رسم قائم رکھنے کی روش اختیار کی اس سے ایک اہم ثبوت یہ فراہم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں میں اتحاد نہیں تھا البتہ کچھ مسلمان حکمراں یا سلطان ایسے تھے جو ذاتی مفاد کی خاطر ضرورت پڑنے پر دوسرے مسلمان حکمرانوں سے متحد ہو گئے۔

مندرجہ بالا صورت حال کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہی نہیں ہوتا بلکہ مرہٹوں کا بھی یہی انداز تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ کتنے ہی ہندو علاقوں کو مرہٹوں نے صرف ذاتی فائدہ کے لیے تاراج کیا۔ وہاں کے تباہ حال عوام نے اورنگ زیب کے حق میں اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا۔ عقیدت مندی صرف اس لیے کہ نہ صرف اورنگ زیب بلکہ اس سے پہلے بھی یہی چیز نظر آتی ہے کہ عوام ہمیشہ ٹیکس کا بوجھ برداشت کرتے اور بے بس ہوتے ہیں۔ تعلیم کا فقدان، ذرائع آمد و رفت کی کمی اور اقتصادی مشکلات کی وجہ سے عام رعایا تمام حکمرانوں کو خواہ وہ ہندو ہوں یا غیر ہندو ایک جیسا ہی سمجھتی اس لیے کہ ان کا استحصال سب نے یکساں طور پر کیا۔

مرہٹوں کی فوج میں صرف ہندو ہی نہیں تھے بلکہ اعلیٰ فوجی عہدوں پر بہت سے اہل اور باصلاحیت مسلمان فائز تھے۔ اور مسلم طاقتوں کے خلاف انھوں نے نہایت ایمانداری کے ساتھ مرہٹوں کا ساتھ بھی دیا۔

لہٰذا ہمیں کہنا پڑے گا کہ تمام مسلمانوں کا ایک ہونا اور بالاتفاق سبھی ہندوؤں کی جداگانہ حیثیت سمجھنے کی بات انگریزوں کے زمانہ کی پیداوار ہے۔ اور اس بے بنیاد بات کو باور کرانے کے لیے حقائق کو نظر انداز کیا گیا یا اس کی تفصیل اطمینان بخش طریقہ سے نہیں کی گئی۔

اس حقیقت سے روشناس ہونے کے لیے اگر اورنگ زیب کے زمانہ کے اسباب اور عوامل کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو دور حاضر کے حالات کا جائزہ لینے سے بھی اس حقیقت کو بآسانی سمجھا یا محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں ہر سال سیکڑوں واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جن میں مسلمان مسلمان کا مخالف نظر آتا ہے اور ہندو کی گولی سے ہندو کا سینہ چھلنی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے برعکس بہت سے ہندو کنبوں کا روزگار مسلمانوں کے ہاتھ میں اور بہت سے مسلمانوں کی زندگی ہندوؤں کی سرپرستی میں بسر ہو رہی ہے۔ یہ حقیقت علیحدگی پسندی یا آپسی منافرت نہیں بلکہ ہندو اور مسلمانوں کے اشتراک سے پیدا شدہ ایک ایسے ماحول کی تصویر پیش کرتی ہے جس میں سماجی، سیاسی، اقتصادی یہاں تک کہ مذہبی معاملوں میں بھی ہندو اور مسلمان ایک جیسے اور گھلے ملے دکھائی دیتے ہیں نہ کہ ایک دوسرے سے الگ اور ہٹے ہوئے۔

اسی طرح اورنگ زیب کے زمانہ میں مذہبی منافرت کا ماحول ہوتا اور اسی کے لیے ہندو اور مسلمان نبرد آزما ہوتے تو اورنگ زیب کے ساتھ نہ تو جے سنگھ ہوتا اور نہ ہی شیواجی کی حمایت میں مسلمان گولکنڈہ۔

قوم پرستی

مورخین کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ سارے ہندوستان کو ایک ملک مانتے ہوئے اور قوم یا مذہب کو کسی

طرح کی اہمیت دیے بغیر صرف سماجی، اقتصادی، سیاسی اور تہذیبی پہلوؤں کو ہی اہمیت دی جائے، مزید برآں یہ بات بھی صاف نظر آتی ہے کہ عوامی اتحاد کو جوڑے رکھنے یا اسے پارہ پارہ کرنے میں تاریخ نگاری کی خاص اہمیت ہے۔

اسے غلط تاریخ نگاری کا انجام ہی کہا جا سکتا ہے کہ آج بھی ہمارے تعلیمی اداروں پر فرقہ بندوں کا تسلّط برقرار ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کا تمام تر خرچ سرکار برداشت کرتی ہے لیکن طلبا کو ہر قسم کی تعلیم کے نام پر آپسی منافرت اور غلط رجحانات کا شکار بنایا جا رہا ہے۔ مذہبی غیر جانبداری اور آزادی کو دونوں ہی طرف سے چیلنج کا سامنا ہے۔ اگر ایک طرف ہندو قومیت کے علمبردار تمام تشخص کو ختم کر کے یکساں "(بھارتیہ کرن) بن جانے پر زور دیتے ہیں تو دوسری طرف سکھ اور مسلمان مذہب کے معاملہ میں نہایت سخت روّیہ اختیار کرتے ہوئے مذہب کو سیاست سے الگ نہ سمجھنے پر اڑے ہوئے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ان مذہبی عصبیت کے علمبرداروں کا یہ انداز ملکی مفاد کے قطعاً خلاف ہے۔

تمام شواہد کو نظر انداز کرتے ہوئے آج بھی کچھ دانشور ہمارے ملک کے وسطی عہد کو ہندو اور مسلمانوں کے درمیان منافرت اور دشمنی کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ تہذیبی اور ثقافتی حد تک دونوں گروہوں میں خوشگوار تعلقات رہے۔ آرٹ، موسیقی، مصوری صنعت گری اور ادب جس صورت میں اس وقت ہمارے پاس موجود ہے وہ دونوں فرقوں کی صدہا سال کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ ہے۔ پانچ چھ سو سال کے اس عرصہ سے متعلق جو کچھ حاصل ہوا ہے اس میں یہ نشاندہی کرنا یا تلاش کرنا آج بھی ناممکن ہے کہ اس میں کتنے اور کس حصہ کا تعلق کس فرقہ سے ہے۔

اس حقیقت کو دھیان میں رکھ کر کچھ عوامی (عوام پسند) کہے جانے والے بادشاہوں کے بارے میں غور کرنا ضروری ہے۔ رعایا کو ایک قوم سمجھنے والے بادشاہوں میں سب سے زیادہ مشہور موریہ شہنشاہ اشوک اور مغل شہنشاہ اکبر ہیں۔

اشوک کی لاٹوں اور کتبوں کا پھیلاؤ اس کی ہر دلعزیزی کے ایسے ثبوت ہیں جن کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ شمال مغرب میں اس کے کتبے مان سہرا، شہباز گڑھی اور لام دھن تک اور دور تک مغرب میں قندھار تک ملتے ہیں۔ اس نے قندھار، کمبوج اور یونانیوں کو اپنی سرحد پر بتایا ہے۔ اس کی مملکت کی مغربی سرحد پر مصر کے انٹیوکس ثانی کی حکومت تھی۔ مندرجہ بالا تین مقامات کے لوگوں کو عین سرحد کے اختتام پر کہنا غیر واضح ہے کیونکہ اس معاملہ میں اختلاف رائے ہے اور ہنوز طے نہیں ہو پایا ہے کہ یہ لوگ مملکت کے اندر تھے یا سرحد کے پار۔ کتبوں کی تنصیب سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مملکت کے اندر ہی رہتے تھے جنوبی سرحد پر چول، پانڈیہ، ستیہ پتر اور کیرل پتر مملکتیں تھیں جہاں اشوک کا کوئی کتبہ نہیں ملا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مذکورہ

بالا تمام سلطنتیں خود مختار اور آزاد سلطنت کی حیثیت سے قائم تھیں۔[۳۳]

اوّل الذکر قومی یکجہتی اور ملکی سالمیت کے نشان اور ہر دلعزیز عوام شہنشاہ اشوک کے عہد میں اس کی مملکت کے حدود اور اس کی سلطنت کا جو پھیلاؤ نظر آتا ہے وہ اس بات کا مظہر ہے کہ جنوبی ہندوستان کا ایک تہائی حصہ اشوک کے ہندوستان کا جزو کبھی نہیں بن سکا۔

اشوک کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں اکبر کو دوسرا ملک گیر شہنشاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں اختلاف رائے نہیں کہ اکبر مغل دور کا سب سے زیادہ مشہور بادشاہ رہا ہے۔ اکبر ایک عظیم سلطنت قائم کرنے میں کامیاب رہا لیکن اشوک کی طرح جنوب کے صوبے اس کے قبضہ میں بھی نہیں آسکے۔ وہ اپنے فوجی محرکات فوجی کارروائیوں اور فتح کے منصوبوں کے تحت صرف ریاست احمد نگر تک کے علاقہ کو ہی ایک مملکت کے سائبان اور سیاسی وحدت میں ضم کر سکا۔ حقیقی صورت یہ تھی کہ بیجاپور، گول کنڈہ اور احمد نگر ریاستوں نے کشیدگی اور جنگ کا ایسا ماحول قائم رکھا کہ وہ اکبر کے لیے دردِ سر بنا رہا اور وہ وہاں اپنا اقتدار قائم نہیں کر سکا۔

اگر اشوک اور اکبر کے سلسلہ کے مندرجہ بالا تنقیدی جائزہ سے ہم اتفاق کرتے ہیں اور پھر بھی اگر انہیں عظیم اور کل ہند حکمراں سمجھتے ہیں تو اورنگ زیب کے حق میں ناانصافی کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا حکمرانوں سے اگر اورنگ زیب کا موازنہ نہ بھی کیا جائے تب بھی یہی آشکارا ہوتا ہے کہ تقریباً ۶۰ سال کا طویل عرصہ جس کا تعلق اورنگ زیب کی حیات اس کے کردار اور کارگزاریوں سے ہے بجائے خود ہندوستان کی تاریخ قرار پاتا ہے۔ پچاس سال تک (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) وہ حکومت کرتا رہا۔ اس کے عہد میں مغل سلطنت کی وسعت اپنی آخری حدود تک پہنچ گئی تھی۔ عہد قدیم سے انگریزوں کی حکومت قائم ہونے تک ہندوستان میں اتنی وسیع سلطنت کا قیام کبھی نہیں ہوا۔ غزنی سے لے کر چاٹگام تک اور کشمیر سے کرناٹک تک عظیم ہندوستان ایک ہی حکمراں اورنگ زیب کے تحت تھا۔ اس سلطنت کے مختلف علاقوں کا بندوبست چھوٹے درجہ کے حکمرانوں (نوابوں یا راجاؤں) کے سپرد نہ رہ کر براہِ راست بادشاہ کے تقرر شدہ عمّال کے ذریعہ ہوتا تھا۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے اورنگ زیب کے زمانہ کا ہندوستان اشوک، سمندرگپت یا ہرش کے عہد کے ہندوستان سے کہیں زیادہ وسیع اور مکمل تھا۔

اورنگ زیب کی سلطنت کی اس قدر وسعت اس کی اہلیت اور کثیر عوام کی حمایت کا نتیجہ تھی۔ اتنی وسیع سلطنت کا قیام اسی صورت میں ممکن تھا جب یہاں کی تمام قوموں کو مساوی حقوق، ذرائع اور آسانیاں حاصل ہوں۔

آپسی اختلاف رائے کے باوجود خاص معاملوں میں کبھی اختلاف نہیں رہا اور اسی کے نتیجہ میں انگریزوں کے خلاف ہندو اور مسلمان دونوں کاندھے سے کاندھا ملا کر لڑے اور اس اتحاد نے ہتھیار کا کام دیتے ہوئے انگریزوں کے سارے منصوبوں کو ناکام بنا دیا۔ اس اتحاد کی بنیاد اگر پہلی مرتبہ اشوک کے زمانہ میں اور دوسری بار اکبر کے عہد میں مضبوط ہوئی تو اورنگ زیب کے ہندوستان میں پوری طرح ابھر کر اپنی انتہا کے آخری مرحلے تک پہنچ گئی۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان میں جتنی طاقتیں (بیجاپور، گول کنڈہ، مرہٹے، راجپوت، افغان اور سکھ) دکھائی دیتی ہیں ان میں سے کوئی بھی طاقت علاقائی طاقت سے بڑھ کر قومی درجہ کی طاقت ہونے کی حیثیت اور اہلیت نہیں رکھتی تھی۔

مورخین کے مابین یہ اب بھی ایک مسئلہ سا بنا ہوا ہے کہ وہ ایسی مسلم شخصیت کو اوّلیت دیں جس نے پورے ملک کی یکجہتی کو ایک دھاگے میں پرونے کی کوشش کی اور بالآخر کامیابی نصیب ہوئی یا ایسے حقائق کو جن میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے اور انھوں نے اس یکجہتی کے دھاگے کو توڑنے ہی میں اپنا سارا وقت گزار دیا۔ دوسرے الفاظ میں ہم اس طرح کہیں کہ مورخین اس طاقت کی حمایت کریں جس نے سارے ملک کو شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک ایک بندھن میں باندھے رکھنا چاہا (مگر اپنی یا ہماری بدقسمتی سے وہ طاقت مسلمان تھی) یا ان طاقتوں کی حمایت کریں جو محض ذاتی مفاد کو ہی ہمیشہ ترجیح دیتے ہوئے مرکزی اقتدار کی جڑیں ہلانے اور اسے اکھاڑنے میں مصروف ہیں۔ (یہ طاقتیں ہندو بھی تھیں اور مسلمان بھی لیکن بعد کے تنگ نظر تاریخ نگاروں کو ان میں صرف ہندو طاقتوں کے نام اجاگر کرنا یاد رہے) جذباتی میلان تو یہ ہے کہ یہ سب ٹھیک ہی ہوا۔ اگر مرہٹے اورنگ زیب کی مضبوط مرکزی سرکار کو دھکے دے دے کر کمزور نہ کرتے تو یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ مسلمانوں کی مضبوط حکومت کتنی دور اور کتنی دیر تک قائم رہتی۔ درمیان میں بھلے ہی انگریزوں کی حکومت آگئی لیکن مسلم حکومت سے تو مستقل طور پر چھٹکارا مل گیا۔ مگر عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ جو کچھ ہوا ٹھیک نہیں ہوا۔ اگر مرکز کمزور نہ پڑتا تو غیر ملکی طاقتوں کو ہماری طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے کی کبھی ہمت نہیں پڑتی، ملک پر قبضہ کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ٹیپو سلطان، سراج الدولہ، بہادر شاہ ظفر، ویر کنور سنگھ، رانی جھانسی، تانتیا ٹوپے اور حضرت محل غیر ملکیوں کے ہاتھوں جان گنوانے اور بدلہ میں وطن کے لیے کچھ بھی نہ کر سکنے کے بجائے ملک کی قومی یکجہتی کا خوبصورت محل بنانے میں کامیاب ہو سکتے تھے اور اگر یہ نہیں ہوا ہوتا تو ممکن تھا کہ ملک تین ٹکڑوں میں کبھی تقسیم نہ ہوتا۔

باب ۔۴

جزیہ

اورنگ زیب کے زمانہ میں لفظ جزیہ کی کافی شہرت رہی۔ بہت سے دانشوروں نے یقینی طور سے یہ مان کر جزیہ کو ہندوؤں کے خلاف ایک ایسا ہتھیار بتایا جسے استعمال کرکے اورنگ زیب نے بیشمار ہندوؤں کو مسلمان بنا دیا۔

"فخرالدین علی احمد لیکچر" کے دوران حال ہی میں ستیش چندر نے بتایا کہ جزیہ ہندوؤں سے لیا جانے والا ایک محصول تھا جس کی اجازت شریعت دیتی ہے۔ امام ابو حنیفہ کے مطابق مسلم حکومت میں جب غیر مسلم لوگ اس کی بالا دستی اور اقتدار کو تسلیم کر لیتے ہیں تو انھیں ذمّی کہا جاتا ہے۔ ذمّی کے معنی یہ ہیں کہ ان غیر مسلم لوگوں کی حفاظت سماجی، اقتصادی مذہبی اور سیاسی نقطۂ نظر سے مسلم حکومت کے ذمّہ ہوگی اور اس کے بدلہ میں حکومت ان سے محصول لے گی۔ مندرجہ بالا نقطۂ نظر اور شریعت کے مطابق اورنگ زیب نے ہندوؤں کے تحفّظ کی گارنٹی لی اور اس کے عوض جو محصول اس نے لیا وہ جزیہ کہلایا۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں مذہب اسلام کی تبلیغ و اشاعت کرنے کے لیے علما کی ایک ایسی مذہبی تنظیم تھی جو خود کو حکومت سے کہیں زیادہ اونچا اور افضل سمجھتی تھی۔ عام طور پر ایسے ہی لوگوں نے ہندو مذہب کے خلاف زیادہ آواز اٹھائی لیکن اس تنظیم سے بھی زیادہ بڑی ایک اور تنظیم تھی جس میں ایک سے ایک بڑھ کر بااثر اور اسلام کی پوری معلومات رکھنے والے لوگ تھے۔ اس تنظیم نے مذہب کی بنیاد پر مسلم اور غیر مسلم میں کسی طرح کا فرق نہ سمجھتے ہوئے سبھی کو ایک ملک کا باشندہ سمجھا۔ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے اورنگ زیب کے زمانہ میں اہلیت کے مطابق ہندو اور مسلمان دونوں کو فائدہ پہنچا، اور دونوں کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی طرح بڑے پیمانہ پر فرقہ وارانہ جھگڑوں کا ثبوت اس زمانہ میں نہیں ملتا۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں جتنی لڑائیاں ہوئیں وہ کسی قوم یا فرقہ کے خلاف نہیں بلکہ حکومت کو مضبوط بنانے

کے مقصد سے لڑی گئیں۔ اگر مذہب یا کسی مخصوص قوم کو دھیان میں رکھتے ہوئے لڑائیاں لڑی جاتیں تو اورنگ زیب مسلم ریاست گول کنڈہ اور بیجاپور کی حکومتوں پر کبھی حملہ نہ کرتا۔

اسی ذیل میں ستیش چندر بتاتے ہیں کہ گول کنڈہ پر حملہ کرنے کے سلسلہ میں قاضی القضاۃ سے اورنگ زیب نے فتویٰ مانگا تو اس نے بتایا کہ اسلام کی رو سے ایک مسلم سلطنت پہ حملہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ تمام مسلمان ایک ہیں۔ اس پر اورنگ زیب نے قاضیٔ دربار کو معزول کر کے ایک دوسرے صاحب علم قاضی کا تقرر کیا جس نے دشمن مسلم حکومت پہ حملہ کرنے کو درست قرار دیا۔ چنانچہ یہ واقعہ بھی اورنگ زیب کے غیر جانبدارانہ خیالات کو ظاہر کرتا ہے۔

"ہندوؤں پر جزیہ لگانا مناسب نہیں" کہنے سے پہلے ہمیں اس بات پر دھیان دینا زیادہ مناسب ہوگا کہ اپنی حکومت کے قیام کے بائیس سال بعد ۱۶۷۹ء میں اس نے جزیہ لگایا۔ اور اپنے انتقال کے آخری لمحات میں جزیہ ختم کرنے کا حکم دیا۔ جس کو اورنگ زیب کے انتقال کے بعد پوری طرح عمل میں لایا گیا۔ اورنگ زیب نے محسوس کیا تھا کہ غیر مسلم رعایا کو سماجی، اقتصادی اور مذہبی اعتبار سے تحفظ دینا اب اس کے لیے ممکن نہیں رہا اس لیے اس نے جزیہ معاف کر دیا۔ سرکاری اہل کار اور عہدیدار (عمّال)، فوجی (راجپوت)، عورتیں، اندھے، اپاہج، بچے، غریب، سیلاب، خشک سالی اور وبائی امراض سے متاثرہ علاقوں کے ساکن جزیہ سے مبرّا تھے۔ ماحصل یہ کہ بمشکل دس فیصد مالدار ہندوؤں سے اوسطاً دورو آٹھ آنہ فی سیکڑہ کی در سے جزیہ وصول کیا گیا۔

یہ کہنا کہ جزیہ ہی کی وجہ سے ہندوؤں نے اورنگ زیب سے بغاوت کی، درست نہیں۔ اورنگ زیب ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہا کہ راجپوتوں کے ساتھ اس کا خوشگوار تعلق قائم رہے لیکن اس میں اسے مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ پھر بھی اس نے اکبر کی طرح ڈرتے ہوئے متذبذب یا غیر یقینی اصول کو اختیار نہیں کیا۔ اکبر کے بارے میں یہاں یہ بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ راجپوتوں کی بغاوت کو ابتدا میں تو اکبر نے دبا دیا تھا لیکن ۱۵۶۱ء کے بعد اس نے اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کی۔ تلوار کے بل پر پوری طرح راجپوتوں پر قابو پانا اسے ممکن نظر نہیں آیا اس لیے اس نے شادی کے تعلق، مذہبی آزادی، جزیہ کی معافی (۱۵۶۴ء) اور سفر کے محصول کے خاتمہ (۱۵۶۳ء) کی بنیاد پر شمالی ہندوستان کے قوی تر راجپوتوں سے تعلق بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔

ہندوستان پہ مسلمانوں کی حکومت تقریباً چار سو سال تک رہی اور زیادہ تر زمانوں میں جزیہ وصول کیا گیا اس کے باوجود عہد قدیم سے چلے آئے مذہبی معتقدات اور مذہبی مقامات کی اپنی حیثیت برقرار رہی۔ اس بات کا کوئی ثبوت

ہیں کہ جزیہ کی وجہ سے بڑے پیمانہ پر مذہب کی تبدیلی کا عمل ہوا ہو۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو اسلام کے شیدائی[۷] اس کا بیان بڑھا چڑھا کر کرنے سے باز نہ رہتے۔

بہت سے دانشوروں نے کہا ہے کہ کمزور اقتصادی صورت حال کو سدھارنے کے لیے اورنگ زیب نے جزیہ لگایا۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ کمزور اقتصادی صورتحال سے اورنگ زیب گدی پر بیٹھتے ہی آگاہ ہو چکا تھا اور جزیہ اس نے حکومت کے قیام کے بائیس سال بعد لگایا۔

گدی پر بیٹھنے کے دوسرے سال میں اورنگ زیب نے محسوس کیا کہ جانشینی کے مسئلہ پر ہوئی جنگ کی وجہ سے شمالی ہندوستان کی غذائی صورت حال تشویش ناک ہو گئی تھی قحط سالی کے زمانہ کی طرح اناج بڑھی قیمتوں پر فرد بخت ہو رہا تھا۔ تمام سلطنت میں جگہ جگہ درآمدی محصول لگنے سے دشواریاں اور بڑھ گئی تھیں۔ ندی کے تمام گھاٹوں، پہاڑوں کے درمیان گھاٹیوں اور مختلف صوبوں کی سرحدوں پر مال کا دسواں حصہ راہداری یعنی راستوں کی دیکھ بھال اور انھیں محفوظ رکھنے کے لیے لیا جاتا تھا۔ آگرہ، دہلی، لاہور اور برہان پور جیسے بڑے شہروں میں باہر سے لائی گئی ہر کھانے کی چیز پر "پنڈاری" نام کا محصول لیا جاتا تھا۔

اورنگ زیب نے راہداری اور پنڈاری دونوں طرح کے محصول مغل سلطنت کے خالصہ علاقوں میں بند کر دیے۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کو اس نے ایسا ہی کرنے کا حکم دیا۔ شاہی حکم کی تعمیل کی گئی اور کم اناج والے علاقوں میں ضروری اناج بغیر کسی اڑچن کے جانے لگا۔ اناج کی قیمت میں گراوٹ آئی۔ ۱۶۷۳ء میں اورنگ زیب نے اور کئی پریشان کن ٹیکسوں کو بھی ختم کر دیا۔

اپنی حکومت کے تیرھویں سال میں اورنگ زیب نے اپنی سلطنت کی آمدنی اور خرچ کا حساب کیا تو خرچ آمدنی سے زیادہ نکلا لہٰذا خرچ میں کٹوتی کی گئی[۸] جس کا اثر شاہی خاندان پر بھی پڑا۔ اکیسویں[۹] سال میں دربار شاہی کی سجاوٹ میں تخفیف کی گئی۔ کلرکوں کو چاندی کی جگہ مٹی کی دواتیں دی گئیں۔ دیوان عام میں سونے کی ریلنگ کے مقام پر لاجورد پتھر کی ریلنگ لگائی گئی۔ سونے اور چاندی کے عطردان اور دوسرے برتن ہٹا دیے گئے۔ شاہی کارخانوں میں سنہری کپڑے کی تیاری روک دی گئی[۱۰]۔ اقتصادی نوعیت کو دھیان میں رکھ کر تاریخ نویسی کے سرکاری محکمہ جات بند کر دیے گئے[۱۱]۔ چھوٹے محصولوں کو اس نے ختم کرنے کا فرمان جاری کیا[۱۲]۔ اس سلسلہ میں صرف خالصہ زمینوں میں[۱۳] ۲۵ لاکھ کا خسارہ ہوا[۱۴]۔ البتہ یورپین تجار کے ذریعہ غیر ممالک سے درآمد یا برآمد کرنے پر چار فیصدی چنگی وصول کی جاتی۔ اس سے

پہلے مغل حکمرانوں نے اتنی زیادہ چنگی یورپی تاجروں پر نہیں لگائی تھی۔[15] یہ اورنگ زیب کی دوراندیشی سمجھی جائے گی کہ اس نے غیر ملکی بیوپاریوں کے ذریعہ کیے گئے بیوپار کو ہندوستان کے حق میں خطرناک سمجھا۔ اورنگ زیب نے جن چھوٹے محصولوں کو ختم کرنے کا حکم دیا، جاگیرداروں نے ان کا وصولنا بند نہیں کیا اس لیے کہ ایسا کرنے سے ان کی آمدنی میں بھی کمی آتی۔[16] اورنگ زیب کے حکم کی تعمیل راجہ جسونت سنگھ جیسے صرف چند ہی امیروں نے کی۔ زیادہ تر امیروں نے اس چھوٹ سے ہونے والے نقصان کو پورا کرنے کی مانگ اورنگ زیب سے کی۔[17] ایسی حالت میں اسلامی قانون کا بہانہ بنا کر جزیہ کو زبردستی وصول کرنے کی بات منصفانہ نہیں معلوم ہوتی۔[18]

اورنگ زیب کے دور حکومت میں وصول کیے جانے والے جزیہ کا کوئی آنکڑہ ہمیں دستیاب نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ جزیہ دہلی کے سلطانوں نے وصول کیا۔ مغلیہ دور میں بابر، ہمایوں اور اکبر (ابتدائی سال) اورنگ زیب کے زمانہ میں جزیہ وصول کیا گیا۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں جزیہ معاف[19] رہا۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں جزیہ کی سالانہ وصولیابی پر دانشوروں نے شبہ کا اظہار کیا ہے۔ خافی خاں بتاتا ہے کہ ۱۶۸۱ء میں امین جزیہ میر عبدالکریم نے پچھلے سال کے دوران برہان پور شہر سے چھبیس[26] ہزار روپیہ وصول کیے تھے اور تین ماہ برہان پور کے آدھے ساکنوں کے ذمہ ایک لاکھ آٹھ ہزار روپیہ (۱,۰۸۰۰۰) واجب الادا قرار دیے تھے۔[20] فصل خراب ہو جانے پر جزیہ سے کافی حد تک چھوٹ پابندی سے دی جاتی رہی۔[21] عیسائی بیوپاریوں سے برآمدی اشیا پر جزیہ نہ لے کر ڈیڑھ فیصدی مزید محصول لیا جاتا تھا اس لیے کہ ان کے تحفظ کی ضمانت اورنگ زیب نے نہیں لی تھی۔[22]

سر جادوناتھ سرکار[23] کے بقول جزیہ متعین کرنے کے لیے رعایا کو تین درجوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے درجہ میں دس ہزار درہم سے زیادہ کے مالدار لوگ آتے۔ قریشی نے ایک درہم کی قیمت پانچسو گرین چاندی بتائی ہے۔ عرفان حبیب کے مطابق[24] ۱۲ درہم اس زمانہ میں تین روپیہ ۲ آنہ کے برابر تھے۔ دوسرے درجہ میں دس ہزار سے کم اور دو سو درہم سے اوپر والے لوگ آتے تھے۔ دو سو درہم سے کم دولت والے لوگ تیسرے درجہ میں شمار ہوتے تھے۔ جزیہ کے طور پر پہلے درجہ کے لوگوں کو ۴۸، دوسرے کو ۲۴ اور تیسرے درجہ کے لوگوں کو ۱۲ درہم دینا پڑتے تھے۔ سر جادوناتھ سرکار کے اس آنکڑے کے مطابق اگر دس ہزار درہم پر ۴۸ درہم جزیہ لیا جاتا تو آدھ فیصد سے بھی کم کی در ہوتی ہے۔ اور اگر ۲۰۰ درہم پر ۱۲ درہم جزیہ رکھا جائے تو ۶ فیصد کی در آتی ہے۔ سب کا اگر اوسط نکالا جائے تو تقریباً ۲½ فیصد جزیہ وصول کیے جانے کی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور یہ شریعت کے مطابق صحیح در ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی مناسب معلوم ہوتا

ہے کہ یہی در مسلمانوں کے لیے بھی مقرر تھی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ دونوں کے نام الگ الگ تھے ۔ مسلمانوں کے لیے زکوٰۃ اور ہندوؤں کے لیے جزیہ کہلاتا۔ یہاں یہ بتا دینا بھی کم دلچسپی کا موجب نہ ہوگا کہ یہ جزیہ محصول مع جزیہ لفظ کے اسلام کی اپنی خصوصیت نہیں بلکہ ہندوستان کی طرح ایک اور غیر مسلم ملک اور ایک غیر مسلم طاقت کے قانون سے لیا گیا ہے یعنی اسلام سے قبل کا ایران !

ایک اور بات یہ کہ جزیہ صرف ان غیر مسلموں پر عائد ہوتا تھا جو اسلامی سرحدوں کے اندر رہے اور جو غیر مسلم اسلامی حدود سے باہر ہوتے انھیں اسلام کا دشمن قرار دیا جاتا۔ اس لیے ان سے کسی قسم کے تعلق رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جزیہ سے حاصل شدہ نقد رقم ایک علیحدہ خزانہ "خزانۂ جزیہ" میں جمع ہوکر کار ہائے خیر میں صرف کی جاتی (جس میں بیواؤں اور یتیموں کی امداد بھی شامل تھی) اس بنیاد پر کچھ دانشوروں کی یہ بات رد کی جا سکتی ہے کہ اورنگ زیب نے جزیہ کے ذریعہ اپنے اقتصادی بوجھ کو ہلکا کیا۔[۲۵]

جزیہ کا استعمال نیک کاموں میں کرنے کے معاملہ میں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے مطابق جسمانی اعتبار سے کمزور یا معذور سبھی مسلمانوں کے خورونوش کا بندوبست حکومت کو کرنا تھا۔ اور خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جنھیں اسلامی قانون یعنی شریعت کا تھوڑا بہت علم تھا۔ اس کے علاوہ بیوائیں اور یتیم وغیرہ بھی تھے جنھیں خوراک مہیا کرانا حکومت کی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی۔ بلبن سے اکبر کے زمانہ تک کسی نہ کسی صورت میں ایسا بندوبست کیا گیا۔ اورنگ زیب کے عہد میں حالات نازک ہو گئے عرفان حبیب[۲۶] بتاتے ہیں کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں جزیہ نامی سرکاری محصول لگانے کے صرف دو سال بعد ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ جزیہ میں رعایت پانے والے غیر مسلموں پر زکوٰۃ کے نام سے بادشاہ کے حکم کے تحت سرکاری محصول لگا دیا گیا۔ یہ فرمان جاری کیا گیا کہ قرآن میں جو انتہائی چھوٹ کی اجازت ہے اسے چھوڑ کر اس سے زیادہ مال پر زکوٰۃ اور دیگر محصول لگایا جائے اس طرح اپنی حکومت کے چھبیسویں سال میں اورنگ زیب نے مسلمانوں پر دوبارہ زکوٰۃ عائد کر دی۔

قبول اسلام

شری رام شرما[۲۷] نے اورنگ زیب کے زمانہ میں قبول اسلام کی بابت مختلف ذرائع سے کچھ ایسے لوگوں کے نام جمع کیے ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی وجہ سے اپنا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا ۔

اپریل ۱۶۶۷ء میں سود خوری کے الزام میں چار ہندو قانون گویوں کو عہدہ سے معزول کیا گیا۔ سزا پانے کے کے ڈر سے ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا چوکی گڑھ کا انچارج بننے کے لیے بھوپ سنگھ نے اپنے بھائی مرار(ی)داس کو اسلام قبول کر لینے کی صلاح دی لیکن اس نے اپنے بھائی کے لالچ بھرے مشورہ کو تسلیم نہیں کیا اور ہندو ہی رہا۔ ۱۶۸۱ء میں

منوہرپور کے زمیندار دیوی چند رتے اسلام قبول کیا تاکہ ۲۵۰ فوجیوں کے بجائے ۴۰۰ کا منصب حاصل کرنے کے لیے ۱۵ جنوری ۱۷۰۴ءکو اسلام قبول کیا۔ راجہ اسلام خاں تے ہندو مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا۔ تاکہ اپنی بہن کی شادی اورنگ زیب کے بیٹے سے کرسکے، لیکن یہ شادی نہیں ہوسکی۔ جاگیر حاصل کرنے کے لیے رام پور کے شاہی منصب دار راؤ گوپال سنگھ کے بیٹے رتن سنگھ نے اسلام قبول کیا۔ پل مئو کے راجہ نے کئی رعایتوں کو ٹھکرا دیا لیکن اسلام قبول نہیں کیا۔

اس طرح ثابت یہی ہوا کہ ترقی پانے اور اقتصادی فائدے کے لالچ میں ہی کچھ ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ ایسے آنکڑے یا ثبوت نہیں ملتے جن سے اس مشہور لیکن بے بنیاد بات کو حمایت حاصل ہوسکے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں تلوار کے بل پر بڑے پیمانہ پر ہندوؤں کو مسلمان بنایا گیا۔

باب ۔ ۵

اورنگ زیب کے بعد ہندوستانی سلطنت کا زوال

مذکورہ بالا تمام حقائق اور طریقۂ کار کو دھیان میں رکھتے ہوئے مغل سلطنت کے زوال کے اسباب کو اورنگ زیب یعنی اس کی حکمت عملی میں تلاش کرنا سیدھے راستہ سے بھٹک جانے کے مترادف ہوگا۔

اِرون اور جادو ناتھ سرکار نے بادشاہ اور اس کے درباریوں کا انتہائی آرام طلب ہو جانا ہی مغل سلطنت کے زوال کا خاص سبب مانا ہے۔ ان دانشوروں کے اس خیال کو تسلیم کر لیا جائے تو شاہجہاں کے زمانہ میں ہی مغل سلطنت کا پوری طرح زوال ہو جانا چاہیے تھا۔ پھر اور ایک جگہ اورنگ زیب کی مذہبی اصول پرستی سے پیدا شدہ ہندو مسلمان کی تفریق کو جادو ناتھ سرکار نے اصل وجہ بتایا ہے۔ کتنے ہی آثار اور شواہد کی بنیاد پر پہلے ہی یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ اورنگ زیب کو اپنے مخالفین سے دشمنی تھی خواہ وہ باپ ہو یا بھائی، بیٹا ہو یا بیٹی اور ہندو ہو یا مسلمان۔

منصب داری اور جاگیرداری بند و بست میں ستیش چندر نے مغلوں کے زوال کے اسباب تلاش کرنے کی کامیابی کے ساتھ کوشش کی ہے۔ اور اس کی تائید عرفان حبیب نے بھی کی ہے۔ کچھ دانشوروں کی رائے میں سلطنت کی وسعت ہی زوال کا سبب بنی۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہر حکمراں کی پہلی کوشش سلطنت کو وسیع کرنا ہی ہوتی ہے اور یوں تو مغلیہ عہد میں ہی بیجاپور، گول کنڈہ اور مرہٹہ وغیرہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی مثالیں ہمارے پاس موجود ہیں جن سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں بھی زوال سے بچ نہیں سکیں۔

اٹھارویں صدی میں مغل سلطنت کے زوال کے علاوہ ایم اطہر علی نے دوسرے ممالک میں صفوی، سلطنتِ عثمانیہ اور اُزبک سلطنت کے زوال کا تذکرہ کرتے ہوئے چند عام قسم کے اسباب کی طرف رجوع ہونے کے لیے دانشوروں کا دھیان مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ برطانیہ اور روس کے ڈرامائی اقدام سے پہلے مذکورہ بالا سلطنتوں کا زوال ہوا۔

عالمی تجارتی مرکز کی شکل میں یورپ ۱۵۰۰ء اور ۱۷۰۰ء کے درمیان عروج حاصل ہوا اور غیر ملکی تاجروں کے ذریعہ ہندوستان کے اقتصادی استحصال کا انتہائی ٹھوس ثبوت سترہویں صدی سے ملنے لگتا ہے۔ اس غیر ملکی استحصال سے قبل حکمراں طبقہ کو جو آمدنی ہندوستانی تاجروں کی بدولت ہوتی تھی اس سے ان کا آرام طلبی کی زندگی بسر کرنا نظریاتی طور پر صحیح ہو سکتا ہے۔ لیکن آگے چل کر اسی فضول خرچ اور آرام طلب زندگی کی روش نے اندرونی خلفشار کو جنم دیا۔ اندرونی انتشار اور امور سلطنت میں بدنظمی یعنی مغل سلطنت کے زوال کی وجہ اس اعتبار سے غیر ملکی طاقتوں کے ذریعہ کیے جانے والے استحصال کے ذیل میں بھی تلاش کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ اس نکتہ پر پہنچ کر ہندوستان کے حکمرانوں میں اورنگ زیب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، اس لیے کہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے سے وہ ہمیشہ دور رہا اور سرکاری خزانہ کو زیر بار نہیں ہونے دیا۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یورپی طاقتوں نے ہی ہندوستان کا اقتصادی استحصال کیوں کیا، جسے مغل سلطنت کے زوال کے لیے لازمی حقیقت سمجھا جا سکتا ہے۔ عہد قدیم میں ہندوستان اور روم کے درمیان ہونے والی تجارت کی مثال ہمارے سامنے ہے جس میں منافع کمانے کے لحاظ سے روم کی بہ نسبت ہندوستان کا پلڑہ کئی گنا بھاری رہا۔ اس سوال کا جواب عام طور پر تکنیکی ترقی میں تلاش کیا جا سکتا ہے، چنانچہ جس بڑے پیمانہ پر یورپی ممالک میں ٹکنالوجی کی ترقی، کاروباری انجمنیں، مشینی کارخانہ قائم ہوئے، اس قدر ہندوستان میں نہیں ہو سکا۔ اس کے علاوہ بلدیاتی ترقی کے لیے جتنی کوشش ہونی چاہیے تھی، نہیں کی گئی۔ ملک کے اندرونی معاملات، حکومت اور مذہبی انتشار اتنے بڑے پیمانہ پر یہاں رونما ہوئے کہ شمال اور جنوب کی تمام ریاستوں کا انتہائی مقصد دشمن کو زیر کرنا اور علاقائی سطح پر امن و سکون کے ساتھ حکومت کرنا تھا۔ لیکن انجام یہ ہوا کہ نہ تو دشمن زیر ہوئے اور نہ ہی یہاں کے راجاؤں یا نوابوں کو چین اور سکون کے ساتھ حکومت کرنا ہی نصیب ہوا۔

صنعت و حرفت کو حکومت کی اطمینان بخش سرپرستی نہیں مل سکی اس لیے یورپ کا مقابلہ یہاں کی پیداوار (تیار مال) اور قیمت سے نہیں کیا جا سکا۔ کاشتکاری پیداوار میں اضافہ کی جس قدر شدید ضرورت تھی جاگیرداروں اور منصبداروں نے وہ پیداوار ی اضافہ نہیں ہونے دیا۔

شہروں کی ترقی ہوتی تو سیلاب، خشک سالی یا وبائی امراض کے سبب کثرت اموات سے تنگ آ کر کاشتکار شہروں کی طرف بھاگتے اور تاجروں یا صنعت کاروں کو مزدور مہیا ہوتے، جیسا کہ برطانیہ میں یہی سب کچھ ہونے کا پتہ چلتا ہے لیکن ہندوستان میں ایسا بھی نہ ہو سکا۔

عالمی صنعتی تبدیلیوں سے فوج سب سے زیادہ متاثر ہوئی۔ غیرممالک میں توپیں تیار ہونے لگی تھیں۔ ہندوستان میں ماہرین ریاضی دانوں اور سائنسدانوں کی حوصلہ افزائی کر کے اس طرح کا قدم اٹھایا جاسکتا تھا لیکن یہاں تو غیر سائنسی طریقہ سے بندوق اور چھوٹی توپ ہی بنتی رہی جو ۱۷۰۰ء تک کافی پرانی ٹکنیک ہوچکی تھی۔ مغل اب بھی تلواروں سے لڑنے والے گھوڑسواروں پر تکیہ کیے ہوئے تھے۔ ۱۷۳۹ء میں ہونے والی لڑائی میں نادر شاہ کی فتح مندی کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ اس کی فوجوں نے یورپین اور عثمانی توپ خانہ کی نقل پر بنایا ہوا توپ خانہ استعمال کیا تھا۔

سائنسی کمتری نے ہندوستان میں کاشتکاری اور تجارتی بحران میں اضافہ کیا۔ اسی اقتصادی بحران کے انتہا کو پہنچنے پر سیاسی نااتفاقی اور فوجی بربادی کی ابتدا ہوئی۔ فوجی کمزوری کے اسباب میں مذہب کا رول بھی کچھ کم نہیں رہا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کو پرانے مذہبی عقائد اور رسوم کو بالکل ترک کر دینا چاہئے بلکہ مذہبی عقائد اور رسم و رواج پر قائم رہتے ہوئے اس طرف بھی دھیان دینا چاہئے کہ دنیا کس طرف جارہی ہے اور اسی کے مطابق ہر ملک کو آگے بڑھنے کی کوشش کرنا چاہیے لیکن ہندوستان میں اس قسم کی کوشش پر بھی کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔

مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے بعد حیدرآباد، بنگال اور اودھ جیسی حکومتیں وجود میں آئیں جو اصل میں ختم شدہ سلطنت کے ہی ٹکڑے تھے۔ ان حکومتوں نے اپنی حکمت عملی کے انداز کو وضع کرنے کے لیے مغلوں کے طور طریقوں کو بنیاد بنایا۔ دوسرے درجہ میں مرہٹہ، جاٹ، سکھ اور افغان تھے۔ ان حکومتوں کا حکومت کرنے کا اپنا الگ انداز تھا۔ موجودہ کرناٹک صوبہ اور اس کے قرب و جوار میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی حکومت تھی جس نے مغلوں کے نظام سلطنت کی تقلید کی۔ اس حکومت نے فوج کو جدید ہتھیاروں سے لیس کرنے کی کوشش کی اور اسلحہ سازی بھی۔ تجارتی میدان میں برطانیہ کی پیروی کرتے ہوئے ترقی کی طرف قدم بڑھایا۔

اس طرح مغل سلطنت تقسیم ہوگئی۔

بنگال میں وہاں کے صوبہ داروں (ناظم) نے جو کچھ کیا وہ مرکز کے اشارہ پر کیا۔ صوبہ داروں کے کیے ہوئے بندوبست میں اصلاح کے پیش نظر مرشد قلی خاں نے جاگیروں کو خالصہ میں تبدیل کرنا چاہا جس کی اجازت اسے مرکز سے حاصل ہوگئی۔ اس سے جاگیرداروں کا اقتدار بنگال سے ختم ہوگیا۔ مرشد قلی خاں اس وقت ناظم کے ساتھ ساتھ دیوان (صوبائی مالگذاری وصول کرنے والا وزیر) بھی تھا۔ اس لیے "خالصہ" پر اسی کا قبضہ ہوگیا۔ مرشد قلی خاں اورنگ زیب کا معتمد اور ایماندار آدمی تھا۔ اس نے اور اس کے ماتحتوں نے مغل شہنشاہ کو کثیر رقمیں بھیجیں۔ ۱۷۴۰ء تک آمدنی کا ذریعہ بھی بند ہوگیا اس لیے کہ ساری مالگذاری کے مالک بنگال کے نواب بن بیٹھے۔ جاگیرداروں کا اس میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ لہٰذا مغل امیر کی حیثیت ہی ختم ہوگئی۔

نوابوں نے زمینداروں اور بیوپاریوں میں سے کچھ کو مالگذاری وصول کرنے کے لیے مقرر کیا اس طرح ایک نیا اونچا طبقہ وجود میں آیا اور مخالفانہ کہاسنی کے ایک نئے ماحول کا آغاز ہوا۔ حیدرآباد اودھ وغیرہ علاقوں میں قدیم جاگیرداری رواج برقرار رہا۔ ان علاقوں میں کوئی نیا اعلیٰ طبقہ پیدا نہیں ہوا۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ۱۷۰۴ء سے پہلے مغل دربار میں تاجروں کا کوئی اثر یا ان کی اہمیت نہیں تھی۔ اٹھارہویں صدی میں بنگال کے رؤسائے شہر سے زیادہ با اثر سترہویں صدی میں گجرات کے تاجر تھے۔

مرہٹہ حکومتوں کو مغل تخت کا جانشین اور حقدار تصور کرنا ممکن نہیں۔ یہ ایک متفق الیہ حقیقت ہے کہ مرہٹوں کی یہ ایک ناکام کوشش تھی۔ ۱۷۶۱ء تک کافی کامیابی حاصل کر لینے کے بعد قیام سلطنت کے لیے جدید طریقوں کو بروئے کار لانے میں وہ ناکام رہے۔ "ہندو پد۔ بادشاہ" کا نعرہ دوران حمل ہی مرگیا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ بیشوا اپنے بس بھر نام نہاد آقا ستارا کے راجہ کو بغیر کسی ٹھوس بنیاد کے زیادہ اہمیت دینا نہیں چاہتے تھے۔ اور اصل فائدہ کے لیے بیشوا مغل بادشاہ کے اقتدار کو تسلیم کرنا زیادہ مناسب سمجھتے تھے۔ آگے چل کر نانا پھڑنویس نے بیشواؤں کو ایک محدود دائرے میں محصور کر دیا۔ اقتدار میں آتی ہوئی حکومت پر مکمل اعتماد بھی بیشواؤں نے نہیں کیا۔ مرہٹہ حکومت کا طرز عمل لوٹ مار پر مرکوز ہونے کی وجہ سے اسے عوام کی حمایت بھی حاصل نہیں ہو سکی۔ مرہٹوں کے عظیم مقصد کا نقطہ عروج چوتھ اور سردیش مکھی (چوتھ وصولنا اور سردار کہلانا) یا مفتوحہ علاقوں کو تاراج کرنے تک محدود تھا۔

۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی میں برطانیہ نے بنگال کو اپنے قبضہ میں کر کے سات سال کے اندر مشرقی ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ یہ فتح ایک غیر معمولی حادثہ تھی۔ سارے ہندوستان کا تجارتی ڈھانچہ بدل گیا۔ بنگال اور بہار کی مالگذاری ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمدنی کا ایک مخصوص ذریعہ بن گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے "کورومنڈل" برآمدات کا رخ تبدیل کر دیا۔ اور برطانیہ کی سمت یہ برآمد بڑھ کر بہت جلد پچاس لاکھ پونڈ ہو گئی۔ اس صورت میں ہندوستان کے اقتصادیات کی کمر ٹوٹنے کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ گجرات اور آگرہ کی تجارت کا انحصار بنگال سے ریشمی اور سوتی کپڑوں کے آنے پر تھا۔ چنانچہ ان دونوں مقامات کا تجارتی زوال ہو گیا۔ خشکی کے راستہ سے افغانستان کے راستہ ہونے والی تجارت بھی بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی۔ انیسویں صدی میں جیسے جیسے انگریزوں کا اقتدار بڑھتا گیا ہندوستانی تاجر ویسے ویسے کشمکش سے دوچار ہوتے گئے۔

اس اقتصادی تبدیلی سے مرہٹہ حکومتوں اور افغانوں پر بھی برا اثر پڑنا لازمی تھا۔ ۱۸۰۸ء میں انگریزوں کا اثر دہلی تک پھیل گیا اور ۱۸۰۹ء میں افغان سلطنت کی بنیاد منہدم ہو گئی وہاں تجارت کا تیزی کے ساتھ زوال ہوا اور

کاشتکاروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

یہ ایک قابل غور حقیقت ہے کہ ہاری ہوئی ہندوستانی طاقتوں نے انگریزوں سے مقابلہ کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے تکنیکی ترقی پر دھیان نہیں دیا۔ سندھیا جیسے مرہٹہ سردار اپنے تھوڑے سے سپاہیوں کو یورپی فوج سے ٹریننگ دلا کر ہی رہ گئے۔ بعد میں ان کی فوجیں یورپی فوجوں کے ماتحت رہ کر ہی کام کرنے لگیں۔ جو اور بھی برا ہوا۔ ذہنی سطح پر انگریزی اثر حاوی رہا۔ مغرب کی سائنس کے بارے میں کچھ معلومات فارسی ادب سے اخذ کی گئیں لیکن ان اطلاعات کی اشاعت انگریز افسر یا پادری کی مرضی یا منشا کے مطابق کی گئی۔ انجام کار فارسی ادب نئی اقدار سے دور رہا۔

انگریزوں کے زیر سایہ زندگی گذارنے والے صاحب سیر المتاخرین نے ۱۷۸۱ء میں اپنی کتاب میں مغل نظام حکومت کی ایک مثالی تصویر پیش کی اور اسے انگریزوں کے روبرو رکھا۔ انگریزوں کے سلطنت کو وسعت دینے کے مقصد اور نظریہ کے اعتبار سے کتاب کافی مفید ثابت ہوئی۔ انگریزوں نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا کہ مغل سلطنت کے اندر قائم جماعتیں اور حقوق مستقل اہمیت کے حامل تھے خاص طور سے زمین کی مالگذاری کا دعویٰ کرنے کے لیے مغل انتظامیہ کو بطور مثال ہندوستانی عوام کے مقابلہ کامیاب طریقہ سے پیش کیا۔ مستقل بندوبست کا خیال پوری طرح انگریزوں کے ذہن میں نہیں تھا۔ انگریزوں نے بنگال کی مسلم حکومت کے طرز کو بنیاد بنا کر اسی کے مطابق خود کو ڈھالنا چاہا تھا۔ منرو کی رعیت واڑی رسم مغل زمانہ کی نفاذِ ضبط رسم کی ترقی یافتہ شکل تھی جسے انگریز نے میسور سے چھینے ہوئے علاقہ میں رائج پایا۔ مغلوں نے سارے ملک میں انتظام کے ایک جیسے بندوبست اور سماج سے منظور شدہ ایک اکیلی زبان (فارسی) کو رائج کیا۔ انگریزوں کو جب اس کا علم ہوا تو انھیں حکومت کرنے کے لیے اس بات کو بطور ہتھیار استعمال کرنے میں مدد ملی۔

اس کے باوجود انگریزی حکومت کو مغل سلطنت کی تبدیل شدہ شکل میں نہیں کہا جا سکتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام تر منافع کی صورت میں ملک کی سرکاری آمدنی کو تبدیل کر دینا ہی انگریزی حکومت کے قیام کی اصل بنیاد تھی۔ اجتماعی اور انفرادی ڈھنگ سے ہندوستان کی دولت کو انگلینڈ لے جانا اس سلطنت کا پہلا اور آخری مقصد تھا۔ چنانچہ مغل سلطنت کے باقیات کو انگریزوں نے اپنی خود غرضی کے حصول کی خاطر ایک نئی سمت میں پلٹ دیا۔ مغل خصوصیت کا استعمال پرانے کسی بھی ڈھانچہ کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے نہیں کیا۔

اس طرح نتیجہ کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اورنگ زیب کے بعد وسیع سلطنت کو چلانے کے لیے جس قسم کے اہل حکمرانوں کی ضرورت تھی اس کا فقدان رہا۔ غیر ممالک کے مقابلہ سائنس اور ترقی کی حالت بالکل خراب رہی جس کی وجہ سے

کاشتکاروں اور تاجروں کی حالت خراب اور جنگی استعداد ابتر رہی۔ جاگیرداروں اور منصب داروں نے بھی کاشتکاروں اور تاجروں کی حالت خراب کرنے میں ساتھ دیا۔ اورنگ زیب کے زمانہ تک یورپی طاقتوں کے ذریعہ ہندوستان کا استحصال جس پیمانہ پر ہوا اُس سے کہیں بڑے پیمانہ پر اورنگ زیب کے بعد شروع ہوا۔ اورنگ زیب کا مقابلہ عام طور سے سکھ، مرہٹے، راجپوت اور مسلم ریاستوں وغیرہ سے ہی رہا لیکن بعد میں ہندوستان کا ٹکراؤ غیر ملکی طاقتوں سے ہونے لگا جس میں کمزور قیادت کی وجہ سے ہار یقینی رہی۔ ملک کی اقتصادی صورت حال کو دیکھتے ہوئے اورنگ زیب عیش کوشی کے اخراجات سے دور رہا۔ لیکن بعد کے حکمرانوں نے خود کو قابو میں رکھ کر اس دولت کو سائنس اور تکنیکی ترقی پر صرف نہیں کیا۔ ملک کے عوام کو ایک قوم تصور کرنے کی خوبی یا خصوصیت اورنگ زیب میں تو پائی جاتی ہے لیکن باقی طاقتوں جیسے بیجاپور، گولکنڈہ، سکھ، راجپوت اور مرہٹے وغیرہ میں ایک قومیت کا تصور نابید ہے۔ اسی طرح سے اورنگ زیب کے بعد کے حکمرانوں نے بھی ذاتی عیش و آرام کو اپنا نصب العین بنایا نہ کہ قومی یکجہتی کو۔

مذکورہ بالا تمام عوامل ۱۷۰۷ء کے اردگرد ایک ساتھ موجود تھے۔ انجام کار کچھ ہی سال بعد پلاسی اور بکسر کی جنگیں اور تقریباً سو سال کے اندر ۱۸۵۷ء کا واقعہ سامنے آگیا اور ہندوستان مکمل طور سے ایک غیر ملکی سلطنت کا حصہ بن گیا۔

مندرجہ بالا حقائق سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو تاریخ ساز طاقتیں قوم کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہیں وہ نہ صرف اقتصادی یا سماجی ہوتی ہیں بلکہ شخصی طور پر کسی ایک منفرد آدمی کے طریقہ کار کا بھی اس میں بڑا دخل ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ دخل بھی ایک شخص میں چند مرتبہ کچھ اس طرح دکھائی دیتا ہے کہ جیسے صرف اسی کی وجہ سے تاریخ کے تمام صفحات اُلٹ پلٹ گئے ہوں۔ یہ شخص کبھی اشوک کی صورت میں آتا ہے تو کبھی اکبر کی کبھی اورنگ زیب کی شکل میں اور کبھی گاندھی کی۔

① ۹-ز / ۸۸

اورنگ زیب کے انتقال کے ۱۳۲ سال بعد مغل سلطنت کا زوال ہوا اور اورنگ زیب کو ہی بیشتر دانشوروں نے یہ کہتے ہوئے ذمہ دار ٹھہرایا کہ وہ جنوب کی مسلم طاقتوں کو مرہٹوں کے خلاف منظم نہیں کر سکا۔ جنوب کے ہندو اس کے مذہبی رُخ کو بنیاد بنا کر ناخوش رہے۔ راجپوت سرداروں کی مکمل حمایت حاصل کرنے میں وہ ناکام رہا۔

ہر ایک چیز پر غور کرنے سے مذکورہ بالا سارے ثبوت اور جوازات بے بنیاد معلوم ہوتے ہیں۔ جنوب کی مسلم ریاستوں نے نہ صرف اورنگ زیب کے خلاف مرہٹوں سے سانٹھ گانٹھ کی بلکہ اس کے بیٹے اکبر کو باغی بنانے میں سب سے

زیادہ جنوب کی ہی مسلم ریاستیں ذمہ دار ہیں۔

راجپوتوں کی ریاست میں دو دعویداروں کے درمیان جھگڑے کو سلجھانے کے لیے اس نے دخل اندازی کی۔ راجپوت علاقوں پر اسے براہ راست یا بالواسطہ ہمیشہ قابو رہا۔ بہت سے راجپوت اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔

اورنگ زیب کے نااہل جانشینوں کو سلطنت کے زوال کا واضح سبب کہا جا سکتا ہے۔ اورنگ زیب جیسا پاکیزہ کردار اور کام کرنے کی غیر معمولی صلاحیت بعد کے حکمرانوں میں ناپید تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ وارث نااہل ہونے کے ساتھ بزدل بھی تھے اس لیے رعایا ان کا احترام کرنے کے لیے آمادہ نہ تھی۔ جانشینی کے قضیے میں کامیابی حاصل کرنے والا بادشاہ اپنے عمال اور درباریوں کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتا۔ ایسی صورت میں صوبائی گورنر خود مختار ہونے کا موقع تلاش کرتے۔ اودھ اور بنگال صوبوں کے گورنروں کے ذریعہ خود مختار ریاستوں کا قیام اس کی روشن مثالیں ہیں۔

اقتصادی بدانتظامی کو بنیادی وجہ کہا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر مالیات اور تجارت میں اضافہ کے باوجود کاشت کی پیداوار بقدر ضرورت نہیں بڑھ سکی۔ لگان میں اضافہ کی وجہ سے قابلِ کاشت زمین ہونے کے باوجود بے روزگار کاشتکار مزدوروں کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ منصب داروں کی تعداد میں اضافہ نے بھی اقتصادی حالت کو اور کمزور کیا۔ جاگیروں کی کمی کی وجہ سے جاگیرداروں نے اپنی جاگیروں کو موروثی بنانے کی کوشش کی اور خالصہ زمین پر قبضہ بھی کیا۔

اخراجات کم کرنے کے لیے فوجی اخراجات میں تخفیف کی گئی جس سے فوجی قوت میں تنزل آیا۔

منصب داروں کے تبادلہ سے اورنگ زیب کے زمانہ میں جہاں بندوبست (انتظامی امور) میں زیادہ کارکردگی کی صلاحیت پیدا ہوئی وہاں بعد کے حکمرانوں کی نااہلی اور قابو میں رکھنے کی صلاحیت کے فقدان میں کیے گیے تبادلوں کے نتیجہ میں جاگیردار قلیل مدت میں کثیر دولت اکٹھی کرنے لگے۔ اس طرح رعایا پر ظلم اور زیادتی میں اضافہ ہوا۔

اورنگ زیب کے بعد اجارہ داری کی رسم نے کافی فروغ پایا۔ مختلف علاقوں میں لگان کی وصولیابی کا کام سب سے زیادہ ڈاک (اونچی بولی) بولنے والے کو دیا جاتا تھا۔ لہٰذا ٹھیکہ دار اس علاقہ سے زیادہ سے زیادہ دولت کمانا چاہتے تھے۔ پہلے زمینداروں کے ذریعہ وصول کی جانے والی رقم میں انھیں صرف دس فیصد ملتا تھا۔ لیکن اب یہ چیز ختم ہوگئی آخری اور جان لیوا ضرب غیر ملکی حملہ کی شکل میں ہوا جس کے باعث سلطنت کے پھر سے وجود پذیر ہونے کی رہی سہی امید بھی ختم ہوگئی۔

حکومت کے نظام میں بدانتظامی اور لاقانونیت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ چھوٹے چھوٹے ملازم پیروی کرکے یا رشوت دے کر اعلیٰ عہدے حاصل کرنے لگے۔ تربیت یافتہ اور بہتر قسم کے سپاہیوں کی تعداد میں کمی ہونے لگی تھی۔ دنیا کے کتنے ہی ملکوں میں سائنس کی ترقی اور جدید سامان حرب تیار ہو رہا تھا لیکن ہندوستانی فوج آج بھی پرانے توپ خانہ

پر فخر کرتی۔ یورپی طاقتوں سے امکانی خطرہ کی بات کو سوچ کر ان حکمرانوں کو ایک ترقی یافتہ اور بحری فوج منظم کرنا چاہیے تھی لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ پرتگالیوں اور انگریزوں کے ذریعہ استعمال کیے جانے والے نئے طرز کے جہازوں کو دیکھ کر بھی ان جیسے جہاز تیار کرنے کی کوئی خواہش یا حسرت ان کے دل میں بیدار نہیں ہوئی۔

تجارت سے حاصل شدہ آمدنی اور لگان سے محصلہ دولت کا بڑا حصہ تقریباً ہر ایک حکمران سامانِ عیش و عشرت پر صرف کرتا تھا۔ نتیجہ میں جہاں ایک طرف گاؤں کے کسان، شہری مزدوروں، کاریگروں اور دستکاروں کو اقتصادی مشکلات کا سامنا تھا، وہیں بالادست طبقہ اور مال دار تاجر عیش و آرام کی زندگی گزارنے میں مست تھے اس لیے اٹھارہویں صدی میں موجود ان بالادست اور مقتدر طبقوں کا کرداری اور سماجی زوال ناگزیر ہو گیا۔ بالادست طبقہ کے کنبوں کے افراد ناچ گانے اور شراب کو پہلا مقام دینے لگے تھے۔

یہ طبقہ سلطنت کے زوال کو روک سکنے میں مجبور و ناکام تھا۔ دوسری طرف صوبائی گورنروں کے خود غرضانہ مقاصد کی وجہ سے نئی ریاستوں کے انتظامی افسران نے قابو پانے میں کامیابی حاصل کی۔ یہ مقامی گورنر اپنے فائدہ کے لیے مرکز کے زوال کے خواہش مند تھے اور مرکز نے بھی ان کی خواہشات کی تکمیل میں ان کو مایوس نہ کیا۔

لہٰذا یہ کہنا مناسب نہیں کہ مغل سلطنت کا زوال اورنگ زیب کی وجہ سے ہوا۔ مغل سلطنت کی انتظامی اور اقتصادی ناکامی جاگیری بحران یا جاگیروں کے فقدان کے باعث ہوئی۔ مسئلہ جاگیر نے بہت سے نئے مسائل کو پیدا کیا جنھیں بعد کے حکمران سلجھا نہ سکے۔ اگرچہ اورنگ زیب کے بعد مذہبی پالیسی اور بغاوت کے بیشتر مسائل کا حل بہادر شاہ اوّل کے زمانہ میں نکالا جا چکا تھا اور مغلوں کے مخالف گرو گوبند سنگھ اور جاٹ، ست نامی، مرہٹوں وغیرہ کی بغاوتوں کو خاموش کر دیا گیا تھا، پھر بھی مغل سلطنت انتشار سے بچ نہیں سکی۔

مذکورہ بالا حقایق کے علاوہ اورنگ زیب پر اب بھی بہت کچھ کہنا اور لکھنا باقی ہے۔ حقائق اور تاریخی شواہد کی کمی نہیں ہے اگر کمی نظر آتی ہے تو بیدار ذہن دانشوروں کی جنھیں غیر جانبدارانہ تاریخ کی نئی تعمیر میں ہر ہر اینٹ کی طرح اپنا اپنا تعاون دینے کی اشد ضرورت ہے۔ قوموں کی ترقی کے لیے غیر جانبدار تاریخ کو بھی ایک اہم بنیاد تصور کیا جاتا ہے۔

زیر نظر کتاب میں جو زاویہ نظر پیش کیا گیا ہے وہ صرف ایک کوشش کے بقدر ہے کہ اورنگ زیب اتنا ظالم، ستم گر، ہندو مخالف اور ہندوستانی سلطنت کے زوال اور انگریزوں کی سلطنت کے قیام کے لیے اتنا ذمہ دار نہیں تھا جتنا بتایا گیا۔

رعایا کی اقتصادی سرپرستی کرنا قومی یکجہتی اور ترقی کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہوا کرتا ہے۔ امیری اور غریبی کے درمیان خندق کو پاٹنے اور اونچ نیچ کے اختلاف کو ختم کرنے کے لیے بھی عمومی قسم کی اقتصادی پالیسی اور اسے بروئے

کارلانے کے لیے) سرکار کی بہتر سیاسی پالیسی کا ہونا ضروری ہے۔ اسی بنیاد پر موجودہ نظام بھی قومی یکجہتی کے لیے کوشاں ہے۔ تخت نشینی کے وقت جتنے قسم کے مسائل اورنگ زیب کے سامنے تھے انھیں حل کرنے کے لیے کوئی بھی حکمراں سب سے پہلے عوام پر محصولات (ٹیکس)، کا بوجھ بڑھا دیتا۔ لیکن اورنگ زیب نے سرکاری خزانہ سے پہلے رعایا پر دھیان دیا۔ سامان عیش پر دولت کو فضول خرچ کرنے سے وہ ہمیشہ دور رہا۔ اور اسے ناپسند کیا۔

جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے مشہور عالم وِپل پرشادؔ کا قول ہے کہ کسی بھی زمانہ کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے تین باتوں کو دھیان میں رکھنا بہت ضروری ہے۔ اول یہ کہ تاریخی واقعات کا مطالعہ کسی مقررہ تاریخ سے کرنا مناسب نہیں بمثال کے طور پر کوئی واقعہ یا حادثہ ۱۸۵۷ء میں رونما ہوا تو لازمی طور سے اس کا پس منظر پانچ، دس یا بیس سال پہلے ہی تیار ہوا ہوگا۔ دوم یہ کہ مغلوں کے زوال میں" اورنگ زیب کی ذمہ داری" جیسے سوالات پر غور کرنے سے زیادہ یہ فکر کرنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہندوستانی ریاستوں کا زوال کیوں ہوا اور انگریزوں نے ہندوستان پر فتح پائی تو کیوں ؟ سوئم یہ کہ کسی بھی سماجی، مذہبی یا سیاسی واقعہ کا مطالعہ اس زمانہ کے اقتصادی حالات پر غور کیے بغیر کرنے سے صحیح نتیجہ اور مقصد تک رسائی مشکل ہوگی۔ انھوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ ہم مارکسٹ یا کمیونسٹ افکار کہہ لیں لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی بھی تاریخی واقعہ (انقلاب) براہ راست یا بالواسطہ اقتصادی وجوہ سے متاثر ہوتا ہے۔

انگریز دانشوروں اور ان سے متاثر ہونے والے ہندوستانی دانشوروں نے " زوال کے لیے اورنگ زیب ذمہ دار" جیسے سوالات اٹھاکر بالغ نظر تاریخ دوستوں کو نامکمل اور غلط واقعات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔ بہت سے واقعات کے ایک تقابلی مطالعہ پر کچھ ایسی باتیں نکل کر سامنے آتی ہیں جن کا بیشتر دانشوروں کے شائع شدہ افکار و خیالات میں فقدان پایا جاتا ہے۔

باب - ٦

آخر میں

بی. این پانڈے کے الفاظ میں "عدم اتحاد، علیحدگی پسندی اور انتشار کو زیادہ اور زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو اس ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان مذہبی جذبات کو بھڑکانا ایک اہم ہتھیار بن چکا ہے۔ یہی غلط انداز فکر دیکھتے ہی دیکھتے مختلف ڈراونی صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ ان میں سے ایک صورت "ہندوستان کی تاریخ نگاری" ہے جس میں دونوں طرف کے تخریب پسند عناصر تاریخی حقائق اور اس کی رفتار کی شکل اس طرح مسخ کر دیتے ہیں کہ ان تحریروں کے ذریعہ ان کے تصورات کو ایک جیتا جاگتا قالب مل سکے۔

ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں ہندوستانی تاریخ کی کتابیں ایک زمانہ سے پڑھائی جا رہی ہیں۔ ان کا اصل خاکہ یورپی مصنفوں کا ترتیب دیا ہوا ہے ہم ابھی تک فرقہ واریت اور جانبداری کے اس بوجھ کو اتار پھینکنے میں کامیاب نہیں ہو سکے جو یورپی اسکالروں نے ہمارے دماغوں میں بھر دیا ہے۔ تاریخ کہلائی جانے والی ان کتابوں نے قارئین کے ذہنوں کو بری طرح متاثر کیا اور قومی زندگی کے ذرائع کو منتشر کر دیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو ہندو تہذیب اور رسم و رواج کو تباہ کرنے اور ہندو مندروں اور محلوں کو منہدم کرنے والے ایسے بد دماغ بت شکنوں کی شکل میں پیش کیا ہے جو مصیبت زدہ ہندوؤں کو اسلام قبول کرنے یا تلوار سے گردن کٹا دینے پر مجبور کرتے تھے۔

ان حالات میں یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوتا کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگ بچپن سے ہی اس زہر کو پی پی کر ایک دوسرے کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہندوؤں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کا مسلم دور جو آٹھ سو سال سے بھی زیادہ مدت پر محیط ہے، ایک بدترین خواب ہے۔ ایک عام قاری کسی طرح بھی اس زمانہ پر کوئی فخر محسوس نہیں کرتا بلکہ اس طویل درمیانی مدت کو نظر انداز کر کے اس سے قبل کے سنہرے زمانہ کی خیالی تصویر بنانے لگتا ہے۔ دوسری طرف مسلمان انگریز کے ہاتھوں ہوئی مسلم حکومت کی شکست کی وجہ سے ہندوؤں کو منافق سمجھ کر خود اپنی ذات کو ان کارناموں سے مطمئن کرتا ہے، جب اسی کی طرح کے دوسرے مسلمانوں نے یہاں فتح کا جھنڈا نصب کیا تھا مگر وہ اس امید۔ ماضی کو بھول جاتا ہے جس نے اس کے تہذیبی نقش و نگار میں رنگ آمیزی کی اور اگر اس پر وہ فخر کرے تو اس کا فخر کرنا بالکل درست ہوگا۔"[1]

انگریز مورخین نے اس انداز فکر کا فائدہ کس طرح اٹھایا، اس کی وضاحت مندرجہ ذیل جملوں سے ہوگی جو سر ایچ۔ ایم۔ ایلیٹ کی معروف کتاب "ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹوریینس کی پہلی جلد کے دیباچے میں

پڑھنے کو ملتے ہیں "ہمارے یہ تمام بادشاہ سیاہ کارناموں میں غرق نظر آتے ہیں. ایسے حکمرانوں کے زیر اثر کسی استجاب کی گنجائش نہیں اگر اُن کے قانون کے فوارے منتشر ہیں۔ سرکاری آمدنی (وصولیابی) تشدّد اور مار دھاڑ کے بغیر کبھی وصول نہیں کی جاتی۔ گاؤں کے گاؤں جلا دیئے جاتے، اور وہاں کے ساکنوں کے ہاتھ پیر توڑ دیئے جاتے یا انھیں غلام بنا کر فروخت کر دیا جاتا۔ سرکاری عمال رعایا کو تحفظ دینے کے بجائے خود سب سے بڑے لٹیرے اور ڈکیت بنے ہوئے ہیں اور ظالموں کے ظلم کے خلاف غریبوں کو کوئی انصاف نہیں ملتا۔" اس ایک ہی جملہ کے مختصر سے گوشہ میں بھی ہمیں یہی جھلکیاں نظر آتی ہیں کہ مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہندوؤں کا قتل پر قتل ہو رہا ہے۔ ان کے مذہبی جلوسوں پر پوجا اور اشنان کرنے پر پابندیاں عائد ہیں۔ مورتیاں توڑی جا رہی ہیں، مندر گرائے جا رہے ہیں۔ زبردستی مذہب کی تبدیلی اور شادیاں ہو رہی ہیں۔ شخصی جائداد ضبط کی جا رہی ہے۔ ان تمام لوگوں کے پس منظر میں ان ظالم حکمرانوں کی قتل و غارت گری، جبر و تشدّد اور سفّاکی، عیاشی اور نشہ خوری سے واضح ہوتا جاتا ہے کہ ان کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے وہ بے بنیاد نہیں ہے۔[۲]

ہندوستان کے پہلے صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اپنی کتاب[۳] میں لکھتے ہیں۔ "منشی سجان رائے جو اورنگ زیب کے زمانہ کا تاریخ نگار تھا اپنی کتاب 'خلاصۃ التواریخ' میں لکھتا ہے۔ " دیپالپور نامی گاؤں جو کالانور کے پاس واقع ہے وہاں شاہ شمس الدین دریائی کا مزار ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو ان سے بڑی عقیدت ہے۔ ان کے زمانہ حیات سے ہی دیپالی نام کے ایک ہندو کو ان سے اس درجہ عقیدت تھی کہ ان کی وفات کے بعد ہندو اور مسلمان سب نے مل کر اسی ہندو کو ان کے مزار کا متولّی بنا دیا۔ چند سال بعد کچھ مسلمانوں نے مذہب کی آڑ لے کر ہنگامہ کھڑا کر کے اس ہندو کو نظامت کے عہدے سے ہٹانا چاہا لیکن اورنگ زیب کی حکومت نے اس ہنگامہ کو کامیاب نہیں ہونے دیا اور آج جب کہ یہ کتاب (خلاصۃ التواریخ) لکھی جا رہی ہے اورنگ زیب کے زمانہ حکومت کا تیسرا سال ہے اور مزار کی نظامت پہلے کی طرح ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہے۔"

موجودہ بنارس ضلع میں واقع بستی گاؤں کے ساکن جگ جیون کے لڑکے گردھر، مہیش پور پرگنہ حویلی کے پدوناتھ مصر اور پنڈت بل بھدر مصر کو اورنگ زیب نے جاگیریں دیں۔ یہ سب کے سب مندر کے پجاری تھے۔[۴]

ملتان کے مندر تُلامیُ کے لیے کلیان داس مصر کو سو روپیہ مندر کے خرچ چلانے کے لیے مقرر کیے۔ یہ مندر ابھی تک موجود ہے۔[۵]

عہد شہزادگی میں اورنگ زیب نے متعدد مرتبہ اپنے باپ شاہجہاں سے کئی عہدوں پر

ہندوؤں کا تقرر کرنے کی سفارش کی اس کی تصدیق اس کے خطوط سے ہو سکتی ہے جو رقعات عالم گیری میں شامل ہیں۔ انھیں خطوط میں بطور مثال ایک یہ بات اسی ذیل میں ملتی ہے کہ ایلچی پور کے دیوان کا عہدہ خالی ہوا تو اورنگ زیب نے ایک راجپوت عہدیدار رام کرن کی سفارش کی۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے ڈرا دھمکا کر ہندوؤں کو مسلمان بنایا لیکن ہم یہاں ایک ایسی حیرت ناک بات کا بیان کرتے ہیں جس سے اورنگ زیب کے انداز فکر اور ذہنیت کا بخوبی علم ہو جائے گا۔ شاہجہاں نے بندھیرا کے راجہ اندرامن کو تعمیل حکم نہ کرنے پر قید کر لیا۔ جب اورنگ زیب اس علاقہ یعنی دکن کا صوبہ دار ہوا تو اس نے اندرامن کی رہائی کے لیے شاہجہاں سے التماس کیا۔ شاہجہاں نے اورنگ زیب کو لکھ بھیجا کہ اندرامن نے پے بہ پے تکلیف پہنچائی ہے، وہ صرف اس شرط پر رہا ہو سکتا ہے کہ اسلام قبول کرلے۔ اورنگ زیب نے اس بات کی سختی سے مخالفت کرتے لکھا کہ اس شرط کی تعمیل نہیں کی جا سکتی ایسا کرنا ناجائز اور تنگ نظری کا کام ہوگا، راجہ کی رہائی اسی کے شرائط کے مطابق ہونی چاہئے۔ اورنگ زیب کا یہ خط آداب عالمگیری (خدا بخش لائبریری کا قلمی نسخہ) میں موجود ہے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ پر لیکن یہ بات بھی درست معلوم ہوتی ہے کہ اورنگ زیب کے دور میں ہندوستان میں مذہب کو جو اہمیت حاصل تھی وہ آج ہی کے مانند تھی اور اس زمانہ میں بھی لوگ ہندو اور مسلمان کے نقطۂ نظر سے ضرور سوچتے ہوں گے، تو اورنگ زیب جو مذہباً اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا، اس کثیر تعداد رعایا پر جو دوسرے مذہب کو ماننے والی تھی کسی قسم کے ضابطہ اور وصول وضع کیے بغیر اتنے لمبے عرصہ تک اور اس قدر وسیع وعریض ہندوستان پر اس انداز سے کس طرح حکمرانی کر سکتا تھا۔

اس کے متعلق اس نکتہ پر کوئی اختلاف رائے نہیں کہ وہ ہندوستان کے تین یا چار عظیم بادشاہوں میں سے ایک تھا لیکن یہ سمجھنا کہ بی۔ این پانڈے اور ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ راجندر بابو نے جو اس کی مذکورہ بالا تصویر پیش کی ہے، وہی تصویر مکمل ہو یہ صحیح نہیں، ویسے بھی کوئی انسانی تصویر نہ تو صرف سیاہ رنگ کی حامل ہوتی ہے اور نہ محض سفید رنگ کی۔ اورنگ زیب تو ویسے بھی نہ کبیر تھا نہ نانک، نہ چشتی تھا نہ رام کرشن پرم ہنس، نہ رامانج اور نہ تکارام! وہ تو صرف ایک حکمراں تھا جس کے اندر دھنک کے سات رنگوں کی طرح سرخ، ہرا، نیلا، پیلا ہر رنگ موجود ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ اورنگ زیب کو فرشتہ کہنے والے بھی اتنی ہی بڑی غلطی کرتے ہیں جتنی شیطان سمجھنے والے! بس، ہمارا ادراک تو یہ بتاتا ہے کہ اگر سترھویں صدی کے اواخر میں مرکز کو کمزور کرنے والی طاقتوں میں مکمل ہندوستانیت

ہوتی اور وہ متحد ہو کر قوم کو مضبوط بنانے کے نظریہ کے تحت مرکزی حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے والے اورنگ زیب کی مخالفت کرنے کے بجائے اس کی حمایت کرتیں تو مذکورہ بالا تمام وجوہ کے باوجود غیر ملکیوں کی غلامی یا تو شاید آتی ہی نہیں اور اگر آتی بھی تو شاید آتے آتے بہت دیر لگ جاتی۔ بس اسی طرح جیسے کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ پہلے ہی ہم غیر ملکی غلامی کا جوا اپنی گردن سے اتارنے میں مزید دس سال کی تاخیر کر دیتے لیکن اس سے پہلے اپنا قومی کردار بنانے میں مصروف ہو جاتے بالکل اسی طرح جیسے آزادی کی تحریک میں کاندھے سے کاندھا ملا کر کام کیا تو آج یہ سب نہ دیکھنا پڑتا جو آئے دن پیش آتا رہتا ہے۔ مرتے وقت انسان کی آواز میں صرف حق و صداقت ہی کی جھلک نظر آتی ہے۔ زمانۂ تہذیب سے آج تک ہندوستان کی تاریخ میں ایسا کوئی حکمراں نظر نہیں آتا جس نے اپنی طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے معمولی سوالات اور معاملات کو بھی اہم سمجھ کر انھیں دور اندیشی کے ساتھ حل کرنے کی اس طرح کوشش کی ہو جیسی کہ اورنگ زیب نے۔ دنیا نے ہمیشہ اسے ایک بادشاہ کے ہی اعتبار سے دیکھا لیکن "کنبہ کا آقا ہی سب سے بڑا نوکر ہوتا ہے" کی کہاوت کے مصداق اس کردار کو اورنگ زیب فرشتہ پن کے حصوں کے لیے تادم حیات سعی کرتا ہے۔ دنیا نے اسے ہندوستان کی تمام دولت کا مالک سمجھا لیکن وہ اپنے ذاتی خرچ کے لیے زندگی بھر ٹوپیاں سیتا اور قرآن کے صفحات کی نقل تیار کرتا رہا۔ لوگوں نے اسے ہندو مخالف کہا لیکن تمام رعایا کے حق میں اس کا یکساں برتاؤ رہا۔ مسلمانوں نے اسے شیعہ مخالف کہا مگر اس کی جان ایک شیعہ کی مٹھی میں تھی۔ ذی علم حضرات نے اسے بدترین حکمراں بتایا مگر صحیح طور پر اس کی حکومت وسعت کے اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ میں سب سے بڑے رقبہ پر اور مدت کے اعتبار سے ساٹھ سال پر محیط رہی۔ تین مسلم طاقتوں (افغان، بیجاپور اور گولکنڈہ) اور تین ہندو طاقتوں (مراٹھا، سکھ اور راجپوت) کی دشمنی کی تلوار ہمیشہ اس کے سر پر لٹکتی رہی مگر جنگ کے کھلے میدان میں دشمنوں کی تلواروں کے درمیان وہ خدا کی یاد میں غرق ہو جاتا۔ بیوی، بیٹا، بیٹی اور سرکاری خزانہ میں دولت کا انبار اظہر من الشمس شخصیت سب کچھ ہونے کے باوجود مٹی کے ایک ڈھیر بنا اپنی قبر کی محض ہری دوب گھاس سے سجاوٹ کرنے کی خواہش رکھنے والے اورنگ زیب کے چھوڑے ہوئے وصیت نامے پر آئیے آخر میں ایک نظر ڈالیں تاکہ شہنشاہ اورنگ زیب کے اندر چھپا ہوا انسان پوری طرح سامنے آسکے:

اورنگ زیب کا وصیت نامہ

(۱) مذہب سے غافل گنہ گار یعنی اس ناچیز کے کپڑے اور دری کو صدقہ کر کے حسن کی متبرک قبر کو ڈھانک

دینا کیوں کہ بحرِ بیکراں میں ڈوبے ہوؤں کے لیے عفو و رحم کے اس عظیم باب میں داخل ہو کر پناہ لینے کے علاوہ عافیت حاصل کرنے کا اور کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔ اس انتہائی متبرک کام کو انجام دینے کے ذرائع اور اسباب میرے عزیز بیٹے شہزادہ عالی جاہ (محمد اعظم) کے پاس ہیں، انھیں حاصل کر لو۔

(۲) میری سی ہوئی ٹوپیوں کی قیمت میں سے چار روپیہ دو آنہ مہالدار آیا بیگا کے پاس ہیں، اس رقم کو لے کر اس بے سہارا انسان پر چادر ڈالنے میں صرف کرو۔ میرے ذاتی خرچ کی تحصیل میں قرآن نقل کرنے کے معاوضے کے تین سو بچاس روپیہ ہیں۔ میری موت کے دن انھیں فقیروں میں تقسیم کر دینا۔ چونکہ شیعہ فرقہ قرآن کو نقل کر کے رقم حاصل کرنے کو ناجائز سمجھتا ہے، اس لیے اس رقم کو میرے کفن کی چادر یا تکفین کی دوسری ضرورتوں پر خرچ نہ کیا جائے۔

(۳) شہزادہ عالی جاہ کے گماشتہ سے (میری آخری رسوم تجہیز و تکفین کے لیے) ضروری چیزیں لے لینا کیونکہ میرے لڑکوں میں میرا قریب ترین جانشین ہے اور اس پر خلاف مذہب یا مذہب کے مطابق میری آخری رسوم کو ادا کرانے کا میرا پورا استحقاق ہے۔ یہ بے سہارا متنفس اپنے بعد سے متعلق کاموں کے لیے جواب دہ نہیں اس لیے کہ مردہ شخص زندہ لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

(۴) مذہب کی راہ چھوڑ کر گمراہی کی وادی میں بھٹکنے والے مجھ آوارہ کو ننگے سر دفنانا کیونکہ شہنشاہِ کبیر (خدا) کے حضور سر برہنہ حاضر ہونے والا ہر ایک گناہگار یقیناً رحم کا مستحق قرار پاتا ہے۔

(۵) میرے جنازہ کو چارپائی پر رکھنے کے بعد گزی کے کپڑے سے ڈھانکا جائے۔ چاندنی تاننے، گلوکاروں کا جلوس نکالنے اور رسول اللہ کا یوم ولادت منانے وغیرہ، خلاف مذہب نئی رسموں سے گریز کرنا۔

(۶) حکومت کے حاکم یعنی میرے جانشین کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ وہ اس شرمسار اور گناہ گار کی خدمت کے بطور (جنوب کے) ریگستانوں اور ویرانوں میں بھٹکتے رہنے والوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آئے۔ اگر براہ راست اُن سے جرم کا ارتکاب ہو بھی جائے تو فراخدلی کے ساتھ انہیں معاف کر دیا جائے اور انکے جرم کو فراخدلی سے نظرانداز کر دیا جائے۔

(۷) لیکھ پال (پٹواری) کے کام کے لیے ایرانیوں سے بہتر کوئی قوم نہیں ہے۔ شہنشاہ ہمایوں کے زمانہ سے تاحال اس برادری کا کوئی فرد جنگ سے منہ موڑ کر نہیں بھاگا اور ان کے پائے استقامت میں کبھی لرزش نہیں آئی۔ اس کے علاوہ وہ کبھی حکم عدولی یا بداعتمادی کے قصوروار نہیں ہوئے لیکن ان کے ساتھ نباہ کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے اس لیے کہ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ نہایت عزت و احترام کا برتاؤ کیا جائے۔ تمہیں کسی بھی طرح انھیں مطمئن رکھنا ہے۔ اگر اس

کے لیے پالیسی کو بھی کام میں لانا پڑے تو نامناسب نہ ہوگا ۔

(۸) تورانی ہمیشہ سپاہی رہے ہیں ۔ یہ لوگ پیش قدمی، چڑھائی، شب خون اور گرفتاریاں کرنے میں مشاق ہوتے ہیں ۔ جب انھیں کسی لڑائی کے دوران واپسی یعنی پیر پیچھے کھینچنے کا حکم دیا جاتا ہے اس وقت وہ کسی شک، ناامیدی یا شرم کا احساس نہیں کرتے ۔

ہندوستانی تو اپنا سر دینا پسند کریں گے لیکن لڑائی میں اپنی جگہ سے جنبش نہیں کھائینگے ۔ تمہیں اس قوم پر ہر طرح مہربان رہنا چاہیے، کیونکہ کئی موقعوں پر جبکہ کوئی دوسری قوم ضروری خدمات کرنے میں ناکام رہے گی یہ قوم اس کی تکمیل کر دے گی ۔

(۹) بارہہ کے سیّد دعاؤں اور نیک خواہشات کو پیش کرنے والے ہیں ۔ تمہیں ان کے ساتھ قرآن کی آیت "پیغمبر کے قریبی رشتہ داروں کو ان کا منصفانہ حصّہ ادا کرو" کے مطابق سلوک کرنا چاہیئے ۔ قرآن میں ایک آیت ہے میں کہتا ہوں کہ اس کے لیے تم سے اپنے رشتہ داروں سے محبت کرنے کے علاوہ اور کوئی بدلہ نہیں چاہتا ۔ اس بنا پر تمہیں سمجھنا چاہیئے کہ اہل بیت سے محبّت کرنے کا مطلب (رسول خدا) رسول اللہ کو ان کی مساعیِ جمیلہ کا نذرانہ (بدلہ) پیش کرنا ہے ۔ تم ان کے احترام کرنے میں کبھی کسر نہ کرنا اس سے تمہیں دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں فائدہ ہوگا ۔ لیکن بارہہ کے سیدّوں سے معاملات میں بہت چوکنا رہنا چاہیئے ۔ دل و جان سے انھیں چاہنا لیکن ان بارہہ کے عہدہ کو بڑھانا بھی مت، ورنہ وہ حکومت میں انتہائی بااثر شریک بن جائینگے صرف یہی نہیں وہ اپنے لیۓ حکومت ہی کی مانگ کرنے لگیں گے اگر حکومت کی تھوڑی بہت لگام تم انھیں ہاتھ میں لے لینے دوگے تو انجام کار تمہیں بے عزت ہونا پڑے گا ۔

(۱۰) جہاں تک ممکن ہو مملکت کے حکمراں کو گرد و پیش و دور و دراز کے دوروں سے گریز نہیں کرنا چاہیئے، ایک مقام پر قیام بظاہر آرام کا باعث ہوتا ہے لیکن بطور ثمرہ ہزارہا مصائب اور آلام کا بار اس کے اوپر آن پڑتا ہے ۔

(۱۱) اپنے بیٹوں پر کبھی اعتماد مت کرنا نہ اپنی زندگی میں ان سے شیر و شکر ہونے کا رویّہ اختیار کرنا ۔ اگر شہنشاہ شاہجہاں نے دارا شکوہ کے ساتھ تعلق خاص کا برتاؤ نہ کیا ہوتا تو اس کے معاملات اس درجہ کبھی خراب نہ ہوتے ۔ "بادشاہ کے قول (وعدہ) ہمیشہ بے معنی ہوتے ہیں" اس نکتہ کو ہمیشہ دھیان میں رکھنا ۔

(۱۲) مملکت کے حالات سے اچھی طرح باخبر رہنا حکمرانی کی خاص بنیاد ہے ۔ ایک لمحہ کی غفلت برسوں کی ذلیل کا باعث بن جاتی ہے ۔ میری غفلت ہی کی وجہ سے بدبخت شیواجی چھوٹ کر بھاگ گیا اور اسی کے نتیجہ میں مجھے اختتامِ حیات

تک مرہٹوں کے خلاف سخت جدوجہد کرنا پڑی ہے ۔

اپنے بیٹے شہزادہ معظم بہادر شاہ کو قید سے رہا کرتے وقت اورنگ زیب نے یہ نصیحت کی ۔

" ہر ایک بادشاہ کو نرمی اور سختی کے درمیان قائم رہنا چاہئیے۔ اگر دونوں میں سے ایک وصف دوسرے سے بڑھ جاتا ہے تو وہ اس کے تخت و تاج کی بربادی اور خاتمہ کا سبب بن جاتا ہے۔ نرمی کی زیادتی ہونے پر لوگ برابری کا اظہار کرنے لگتے ہیں اور اگر سختی میں اضافہ ہو جائے تو لوگ خوف زدہ ہو کر دور بھاگنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر میرے چچا الغ بیگ اگرچہ بڑے قابل اور بہت سی خوبیوں سے آراستہ تھے مگر خون بہانے میں اتنے بے جھجک تھے کہ معمولی معمولی خطاؤں پر بھی سزائے موت دیدیا کرتے تھے۔ ان کے بیٹے عبداللطیف نے انھیں قید کر لیا اور نہاوند قلعہ میں بھیج دیا۔ راستہ میں انھوں نے ایک آدمی سے پوچھا" میری شاہی طاقت (اقتدار) کے خاتمہ کا تمہاری رائے میں کیا سبب ہے؟ اس آدمی نے جواب دیا۔" تمہارا خون بہانا جس کی وجہ سے لوگ تم سے بچنے لگے۔" میرے محترم جدّ امجد شہنشاہ ہمایوں نے طرح دینے، معاف و درگذر کرنے اور امور سلطنت میں نامناسب حد تک نرمی کا مظاہرہ کیا حالانکہ صوبہ بنگال میں شیر خاں کے قابل اعتراض حرکات و سکنات کے بارے میں بار بار سننے کے باوجود وہ اس کو طرح دیتے رہے اور صرف اس کے باپ حسن سور کو یہ کہہ کر ڈانٹتے رہے کہ "تم اپنے بیٹے کے کارناموں کو جانتے ہو پھر بھی تم اسے روکنے کے لئے کچھ نہیں لکھتے" حسن نے جواب دیا" اس کے کام لکھنے (روک تھام یا سمجھانے بجھانے) کی کیفیت سے آگے بڑھ چکے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضور والا کی نظر اندازی کا کیا انجام ہوگا۔"

اشعار رتجمہ۔ بادشاہ اور پانی دونوں کے لیے ایک مقام پر ٹھہرے رہنا بہت برا ہوتا ہے۔ پانی سڑ جاتا ہے اور بادشاہ اپنی کثیر حمایت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ دورہ در دورے میں رہنے سے ہی بادشاہوں کا اعزاز، اطمینان اور اقتدار قائم رہتا ہے۔"

چٹائی بُننے والے کو لوہار کے کام کا حکم دینا سمجھداری سے باہر کی بات ہے۔"

اپنے بیٹے شہزادہ محمد معظم کو اورنگ زیب نے لکھا" لازمی سمجھ کر بہ سبب مجبوری میں نے تمہیں چند سال تک قید خانہ میں رکھ کر تمہارے انتہائی تباہ کن چال چلن کے لیے تمہیں سزا دی ہے، اس کے باوجود تم اس بات سے مستقبل میں اپنا بادشاہ ہونا طے سمجھو کر اپنی زندگی میں ہی میں نے تمہیں جنت نشان ہندوستان کی صوبہ داری دی ہے ۔

●●

حوالے

دو لفظ

۱۔ مزید مطالعہ کے لیے رومیلا تھاپر "اشوک تھا موریہ سامراجیہ کا پتن" دہلی ۱۹۷۷ء

۲۔ ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اٹس اوون ہسٹورینس " جلد ۸ لندن ۱۸۸۷ء طبع ثانی کتاب محل الہ آباد ۱۹۶۴ء۔

۳۔ سر جادو ناتھ سرکار "ہسٹری آف اورنگ زیب (پانچ جلدیں) کلکتہ۔" انیکڈوٹس آف اورنگ زیب کلکتہ ۱۹۴۲ء

۴۔ میڈیویل انڈین کلچر۔ آگرہ ۱۹۶۴ء

۵۔ ہسٹری آف میڈیویل انڈیا، الہ آباد ۱۹۴۸ء

۶۔ مغل بادشاہوں کی مذہبی پالیسی، نئی دہلی ۱۹۶۷ء

۷۔ دی ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیوپل، جلد ۴۔ ۶، بھارتیہ ودیا بھون بمبئی ۶۷۔ ۱۹۴۷ء۔

۸۔ اکبر دی گریٹ مغل، آکسفورڈ، ۱۹۱۹ء

۹۔ ایگریرین سسٹم آف مغل انڈیا، بمبئی ۱۹۶۲ء "ٹکنالوجی اینڈ اکونامی آف مغل انڈیا" دیوراج چنانا لیکچرس، دہلی ۱۹۷۰ء۔ "دی کرنسی سسٹم آف دی مغل ایمپایر (۱۵۶۶ء۔ ۱۷۰۷ء) میڈیویل انڈیا کواٹرلی ۱۷ (نمبر ۱۔ ۲) علی گڑھ ۱۹۶۰ء۔

۱۰۔ "زمیندارس انڈر دی مُغلس"۔ لینڈ کنٹرول اینڈ سوشل اسٹرکچر ان انڈین ہسٹری، ایل۔ ای۔ فریکنبرگ (ایڈیٹر) لندن ۱۹۶۹ء۔ تھاٹس آن ایگریرین ریلیشنس ان مغل انڈیا' نیو دہلی ۱۹۷۳ء۔

۱۱۔ سامپردایکتا اور اتیہاس لیکھن، نئی دہلی۔

۱۲۔ "مغل نوبلیٹی انڈر اورنگ زیب" بمبئی ۱۹۶۶ء۔ "مغل سامراج کا انت"۔ مدھیہ کالین بھارت۔ عرفان حبیب شمارہ ۱ دہلی ۱۹۸۱ء

۱۳۔ "جزیہ اینڈ دی اسٹیٹ ان انڈیا ڈیورنگ دی سیونٹینتھ (۱۷۲۰ء) سینچری"۔ جرنل آف دی اکنامک سوشل ہسٹری آف دی اورینٹ XII لندن ۱۹۶۹ء۔

۱۴۔ عرفان حبیب، مدھیہ کالین اتیہاس لیکھن اور سامپردایک درشٹی کونٹر' (وسطی عہد کی تاریخ نگاری اور فرقہ وارانہ نظریہ)" ترجمہ "اسرار دھ (برائے جواب، شمارہ ۲۹ جولائی ۱۹۸۷ء صفحہ ۴۰ تا ۴۶۔

۱۵۔ رومیلا تھاپر، ہربنس مکھیا اور وپن چندر" سامپردایکتا اور اتیہاس لیکھن (فرقہ داریت اور تاریخ نگاری) پیوپلس پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔

۱۶۔ رومیلا تھاپر، مدھیہ کالین بھارت (وسطی عہد کا ہندوستان) نئی دہلی ۱۹۷۰ء صفحہ ۱۴۸ تا ۱۷۴۔

۱۷۔ وپن چندر۔ آدھونک بھارت (آج کا ہندوستان) نئی دہلی ۱۹۷۶ء صفحہ ۱ تا ۱۲۔

۱۸۔ اڑیسہ کے سابق گورنر۔

باب ۔ (۱)

(۱) اورنگ زیب (۱۶۱۸ء تا ۱۷۰۷ء) وارانسی، ۱۹۷۰ء بھومیکا (دیباچہ) صفحہ ۳ (۲) بنج محال ضلع میں دودھ ایک بڑا شہر تھا۔ (۳) جادو ناتھ سرکار، اورنگ زیب (۱۶۱۸ء تا ۱۷۰۷ء) صفحہ ۱۱ (۴) ایضاً صفحہ ۱۹-۲۰ (۵) کالیکا رنجن قانون گو" داراشکوہ " دوسرا ایڈیشن صفحہ ۲۱-۵۴ اسی کتاب کے مطابق قندھار پر فتح حاصل کرنے کے لیے داراشکوہ جادوگروں اور ماہرین عملیات کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اندر گری نامی ایک عامل داراشکوہ سے یہ کہہ کر کافی دولت اینٹھ رہا تھا کہ چالیس مؤکلوں کی مدد سے وہ قندھار کو برباد کر دے گا۔ ایک مخصوص رات میں وہ داراشکوہ سے ڈوڑیشیا، ایک بھینس، ایک مینڈھا، پانچ عدد مرغ اور روپیہ پیسہ وغیرہ لے کر جادوئی طاقت جگانے کے لیے کسی پرسکون مقام پر چلا گیا۔ قندھار کا تو کچھ بھی نہیں بگڑا البتہ اندر گری جیسے کتنے ہی بہروپیوں نے داراشکوہ سے کافی دولت اینٹھی۔ دیکھنے کو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ داراشکوہ کو ہندو تنتر منتر میں یقین تھا لیکن اس سے اس کی بے وقوفی جھلکتی ہے)۔ (۶) جادو ناتھ سرکار ایضاً صفحہ ۲۴ (۷) ایضاً ص ۲۵ (۸) ایضاً ص ۲۸ (۹) تاریخ شاہ شجاع ۲۷ پی اور ۹۰ الے، انڈیا آفس۔ (۱۰) آداب عالمگیری ۸، ۷ جادو ناتھ سرکار ص ۴۲ سے ماخوذ۔ برنیر کے مطابق دارا کو شکست دینے کے بعد مراد کو تمام حکومت سپرد کر کے اورنگ زیب نے فقیری اختیار کرنے اور مکہ چلے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ جادو ناتھ سرکار ایضاً ص ۴۴ (۱۱) جادو ناتھ سرکار، ایضاً ص ۴۷

باب ۔ (۲)

(۱) دیکھئے نقشہ (۲) شری حولدار ترپاٹھی "بودھ دھرم اور بہار" بہار راشٹر بھاشا پریشد پٹنہ ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۰، ۱۵۲، دیرگھ نکائے ۲، ۱، ۱ (۳) مہاونس V، ۵۴ (۴) رومیلا تھاپر "اشوک تتھا موریہ سامراجیہ کا پتن"

دہلی ۱۹۷۷ء ص ۳۰-۱ (۵) تِسْسْ کا نام وِتیاشوک، وِگتاشوک، سُدَت اور سُگتر بھی بتایا گیا ہے۔ (۶) پراجی لُسکی 'ایل
لیزنیلدی لیپزراسوکا' پیرس ۱۸۸۰ء ص ۲۲۵ یہ کتاب بہار ریسرچ سوسائٹی میں دستیاب ہے جس کا علم یہاں کے لائبریرین
عزت مآب گوپی بابو کی مہربانی سے ہوا۔ (۷) پراجی لُسکی، ایضاً ص ۲۲۵۔ (۸) گائلس، ٹریولس آف فاہیان، کیمبرج
۱۹۲۳ء ص ۵۶۔ (۹) بودھ بھکشوؤں کے لیے ایک لفظ۔ (۱۰) رومیلا تھاپر، ایضاً ص ۲۷، ۶۳ (۱۱) ایضاً ص ۲۱
(۱۲) دِوْیاوَدان، ۲۵واں اور ۲۹واں اَوْدان، سَچِدانند ترپاٹھی، شُنگ کالین بھارت، شائع کردہ بنارس یونیورسٹی
۱۹۷۷ء ص ۱۳۔ (۱۳) سر جادوناتھ سرکار، اورنگ زیب کے اُپاکھیان، آگرہ ۱۹۶۷ء ص ۸۱۔ (۱۴) ایضاً ص ۱۴
(۱۵) ایضاً ص ۹۵ (۱۶ تا ۲۰) نیلم اگروال، راج ترنگی — کلہن — الہ آباد ۱۹۶۸ء ص ۴-۲۵۳ (۲۱) رومیلا تھاپر
ہرونش لکھیا اور وپن چندر ایضاً ص ۳۴ (۲۲) وپن چندر، آدھونک بھارت نئی دہلی ۱۹۷۹ء ص ۱۲-۱ (۲۳)
ستیش چندر، مدھیہ کالین بھارت، حصہ ۲ ص ۱۱۲-۱۰۰ (۲۴) خافی خان منتخب الباب II ۷۷، کاظم عالمگیر نامہ ۳۶۶
(۲۵) شری رام شرما مغل شاسکوں کی دھارمک نیتی، ص ۱۲۰ (۲۶) خافی خان ایضاً ص ۸، کاظم ایضاً ص ۲-۳۹۱
(۲۷) عبدالحیٔ، مرآۃ احمدی I ص ۲۸۱ (۲۸) شری رام شرما، ایضاً ص ۱۲۳، لیٹرس نمبر ۹۰ (۲۹) ایضاً، نیوز
لیٹر ۶ مئی ۱۷۰۲ء۔ (۳۰) شیر خانی، مرآۃ الخیال ص ۲۹۸۔ (۳۱) منوچی، اسٹوریا دی موگور، ترجمہ اروِن II
ص ۶۔ (۳۲) ایضاً ص ۵-۸۔ (۳۳) ایضاً ص ۹۔ (۳۴) منوچی، II ص ۹، دستور العمل ۳-۱۰۲، اے ٹراورنیر
ٹریولیس اِن انڈیا، مترجم وال II ص ۲۱۰-۱۶۔ (۳۵) مرآۃ احمدی I ص ۲۸۲۔ (۳۶) ایضاً ص ۲۵۱ (۳۷)
خافی خان II ۲۱۳-۱۴، شری رام شرما ایضاً ص ۱۲۹۔ (۳۸) اخبارات، ۲۸ اگست ۱۷۰۰ء شری رام شرما ایضاً
ص ۱۲۹۔ (۳۹) سرکار، اورنگ زیب، وارانسی ۱۹۷۰ء ص ۳-۱۰۲۔ (۴۰-۴۱) منوچی، جلد ۲، ص ۸ (۴۲)
یحییٰ چشتی اورنگ زیب کا استاد تھا۔ (۴۳) مرآۃ احمدی محمد علی خان کا انگریزی ترجمہ ص ۷۰۔ (۴۴) منتخب الباب،
خافی خان کا انگریزی ترجمہ جلد ۲ ص ۵۶۴ (۴۵) ایضاً ص ۵۶۱ (۴۶) ستیش چندر (مذکورہ بالا)۔ (۴۷ تا ۵۰)
سرکار، اورنگ زیب ص ۱۰۳۔ (۵۱) پرسیول، اے ہسٹری آف انڈیا، حصہ ۲، پینگوئن ۱۹۸۵ء ص ۳۴، ۳۶،
۴۹، ۵۳، ۵۸، ۱۳۴۔ (۵۲) جادوناتھ سرکار اورنگ زیب ص ۱۰۲ (۵۳) ایضاً ص ۱۰۶ (۵۴ تا ۵۶)
سرکار، اورنگ زیب کا اپاکھیان، آگرہ ۱۹۶۷ء ص ۲۰۔ (۵۷) ایضاً ایضاً ص ۴۷، ۵۷ (۵۸) ایضاً ایضاً
ص ۹۱۔ (۵۹) ستیش چندر" اتر مغل کالین بھارت کا اتیہاس" (شمالی ہندوستان کی مغلیہ عہد کی تاریخ) میرٹھ ص
۲۹-۱۔ (۶۰) ستیش چندر، مدھیہ کالین بھارت، حصہ دوم ص ۱۰۷-۸۔ (۶۱) بی۔این۔ پانڈے خدا بخش میموریل

اینول لکچرس ۱۹۸۶ء (۶۲) مفصّل معلومات کے لیے مطالعہ کیجیے "دی ویشنوز آف پنڈورا" مرتبہ گریے وال اور بی' این گوسوامی' سینٹر آف ایڈوانس اسٹڈیز شملہ (میرے ہی شعبہ کے پروفیسر سریندر گوپال نے اس کتاب کی نشاندہی کی جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں-)۔ (۶۳) بی۔این۔ پانڈے، خدابخش میموریل اینول لکچرس پٹنہ ۱۹۸۶ء (۶۴) پی سیتارام ناتھ کی تصنیف کردہ کتاب "دی فیدرس اینڈ دی اسٹونس" کے مطالعہ سے تفصیلی معلومات حاصل ہو سکتی ہے۔ (۶۵) بی۔این۔ پانڈے خدابخش میموریل اینول لکچرس پٹنہ ۱۹۸۶ء (۶۶) بی۔این۔ پانڈے ایضاً لکچرس سیریز ۱۲ ص ۱۲-۱۳ (۶۷) ہائی کورٹ پیپرس ۱۹۲۴ء ص ۱۴ (۶۸) ایضاً (۶۹) ایضاً (۷۰) ایضاً ص ۱۵-۱۶ (۷۱) ایضاً (۷۲) آسام ریسرچ سوسائٹی جنوری، اپریل ۱۹۴۲ء ص ۱۲-۱ (۷۳) جرنل آف بمبئی یونیورسٹی، جلد I ص ۵۵ (۷۴) بی' این۔ پانڈے ایضاً (مذکورہ بالا) (۷۵) وہی پنکج پچوری "مندر کا مغلیہ رشتہ" انڈیا ٹوڈے (ہندی) ——— شمارہ ۲۱، یکم ۱۵ ستمبر ۱۹۸۷ء ص ۷۰-۱ (۷۶) شری رام شرما "مغل شاسکوں کی دھارمک نیتی" ص ۱۶۱، مرآۃ احمدی I ص ۱۶۲ (۷۷) شری رام شرما ایضاً ص ۱۶۲ (۷۸) منوچی IV ص ۱۱۸-۱۲۱ شری رام شرما' ایضاً (۷۹) نیوز لیٹر ۷ جولائی ۱۶۶۴' شری رام شرما (۸۰) اعظم' تاریخ کشمیر ص ۱۶۵ (۸۱) زیڈ فاروقی" اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمس" بمبئی ۱۹۳۵ء ص ۹۱-۱۹۰ (۸۲) ماکھن لال رائے چودھری "دی اسٹیٹ اینڈ ریلیجن ان مغل انڈیا کلکتہ ۱۹۵۱ء ۲۶۹ (۸۳) محمد یسین ۔ اے سوشل ہسٹری آف اسلامک انڈیا لکھنؤ ۱۹۵۸ء ص ۴۸، ۲۱۰' ۱۱۔ (۸۴ تا ۸۷) سرکار' ایضاً ص ۷۱۴۔

باب (۳)

(۱) عالمگیر (ترجمہ) سید صباح الدین عبد الرحمٰن' دہلی ۱۹۸۱ء ص ۱۵' ۲۰۔ (۲) ایضاً (۳) محمد اطہر علی "۱۶۷۹ء کے راٹھور ودروہ کے کارن" مدھیہ کالین بھارت شمارہ ۲ مدیر عرفان حبیب ۱۹۸۳ء ص ۱۰۲-۹۳ (۴) مآثر عالمگیری صفحہ ۷۶-۱۷۰ (۵) محمد اطہر علی "دی ریلیجس ایشوز ان دی وار آف سکسیشن ۵۹-۱۶۵۸ء پرو سیڈنگس آف انڈین ہسٹری کانگریس علی گڑھ ۱۹۶۰ء (۶) ماکھن لال رائے چودھری ایضاً ص ۷۲-۲۷۱ (۷) ایضاً (۸) کننگھم ——— سکھوں کا اتیہاس' مرتبہ کلا کر تیواری' ترجمہ رمیش تیواری اور سریش تیواری' اتیہاس پرکاشن سنستھان وارانسی دسمبر ۱۹۶۵ء ص ۷۶ (۹) پیری شیشٹ ۲۲ کے مطابق نانک' انگد' امرداس' ارجن' ہرگوبند گردت ہررائے' ہرکشن اور تیغ بہادر کے بعد دسویں اور آخری گرو گووند سنگھ تھے۔ (۱۰) ایضاً ص ۵۳ (۱۱) ایضاً ص ۵۵ (۱۲) ایضاً (۱۳) ایضاً ص ۵۷ (۱۴) براؤن "انڈیا ٹریکٹس" جلد ۲ ص ۳-۲ (۱۵) کننگھم

سکھوں کا اتیہاس، ص ۷، ۵۔ (۱۶) براؤن 'انڈیا ٹریکٹس ص ۷، ۶ (۱۷) کننگھم — سکھوں کا اتیہاس" صفحہ ،،

(۱۸) یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ گدی کی خاطر اشوک موریہ نے اپنے سو بھائیوں کا قتل کیا گدی حاصل کرنے کے لیے آخری موریہ حکمراں برہدرتھ کو اس کے سپہ سالار پشیہ متر شنگ نے قتل کیا۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں سر پر تاج پہننے کی غرض سے اجات شترو نے اپنے باپ کو قتل کیا۔ تاجِ شاہی کے حصول کی خاطر اپنے باپ شاہجہاں سے نہ صرف اورنگ زیب بلکہ شجاع اور مراد نے بھی بغاوت کی۔ ان تمام واقعات کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سکھ مسئلہ کو طولانی شکل دے کر اورنگ زیب کو قصوروار اور سکھوں کا مخالف قرار دینا دوسرے تاریخی واقعات کو اگر مدِنظر رکھا جائے تو مناسب نہیں۔ (۱۹) انڈیا آفس میں درج فہرست قلمی کتاب ع ۱۳۴۴ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے بیٹے کام بخش کو ایک خط کے ذریعہ اس بات کی سخت تاکید کی تھی کہ کسانوں پر اور دیگر رعایا پر بے وجہ کبھی ظلم و زیادتی نہ ہو۔ اس بات کے لیے بھی متنبہ کیا تھا کہ خاندان در خاندان چلے آئے خدمت گاروں کو نہ تو ملازمت سے برطرف کیا جائے اور نہ ہی انھیں تنگ کیا جائے۔ (۲۰) کننگھم — سکھوں کا اتیہاس" ص ۷۹، ۸۰ (۲۱) جادو ناتھ سرکار (اورنگ زیب ص ۳۴۰) لکھتے ہیں کہ ۱۷۰۳ء کے بعد شیواجی اور شمبھوجی دیہات کو اور تاجروں کو ہندو اور مسلمان کی تفریق کے بغیر لوٹا کرتے تھے اور مغل فوج کے آتے ہی روپوش ہو جاتے تھے۔ (۲۲) رام پرشاد ترپاٹھی (مغل سامراج کا اُتھان اور پتن، الہ آباد ۱۹۸۴ء ص ۳۷۴) لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب بہت اچھا لکھنے والا اور باصلاحیت فوجی تھا۔ مضبوط قوت ارادی اور مستقل مزاجی کا حامل اورنگ زیب سیاسی چالوں اور سوجھ بوجھ کے اعتبار سے عدیم المثال تھا۔ بیورے (حساب کتاب) کی جانچ وہ کافی محنت اور تیزی کے ساتھ کرتا تھا۔ قوت برداشت اس کو بدرجہ اتم حاصل تھی۔ اس کی سنجیدگی اعلیٰ ظرفی اور تحمّل سے لوگوں پر اس کا رعب چھا جاتا۔ اس کی سخت اصول پسندی اور گہری سیاسی پالیسی کے پیش نظر لوگ اس سے خوف زدہ رہتے تھے۔ تکلیف اور پریشانی کے وقت بھی وہ اسپات کے مانند سرد رہتا۔ خوشی میں بھی اس کے چہرے کا رنگ تبدیل نہیں ہوتا تھا۔ اس کی سپاہ اس کے برتاؤ سے خوش رہتی۔ جسمانی، ذہنی یا فکری کمزوری کا الزام اس پر نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ ہمیشہ چڑچڑا اور فکرمند بنا رہتا۔ کسی پر مکمل اعتماد آسانی سے نہیں کرتا اور اس کا احساس نہ دلاتے ہوئے دوسرے سے کام نکالنے کی اس میں اہلیت تھی۔ اس کی مذکورہ بالا خصوصیتوں کو کسی قسم کا چیلنج کرنا ممکن نہیں ہے۔ (۲۳) رومیلا تھاپر "اشوک تتھا موریہ سامراج کا پتن" (اشوک اور موریہ سلطنت کا زوال) دہلی ۱۹۷۷ء ص ۱۳۱۔

<u>باب (۴)</u> | (۱) ستیش چندر، " ایلیگیشن آف ریلیجیس بگوٹری اگینسٹ اورنگ زیب فخرالدین

علی احمد لیکچر، آزاد اکادمی جرنل، جولائی یکم، ۱۲۔ ۱۹۸۷ء ص ۱۰، ۱۲ (۲) ستیش چندر "سترہویں صدی کے دوران بھارت میں جزیہ اور راج" مدھیہ کالین بھارت، مدیر عرفان حبیب شمارہ ۱ دہلی ۱۹۸۱ء ص ۶۹-۸۴ (۴) ستیش چندر، ایلیگیشنز آف ریلیجیس بگوٹری اگینسٹ اورنگ زیب، فخر الدین علی احمد لیکچر، ص ۱۰-۱۲ (۵-۶) اقتدار عالم خاں، "اکبر کے ادھین امروگ تتھا اکبر کی دھارمک نیتی کا وکاس" (۱۵۶۰ء تا ۱۵۸۰ء) مدھیہ کالین بھارت، مدیر عرفان حبیب شمارہ ۲ دہلی ۱۹۸۳ء ص ۶۹، ۷۰۔ (۷) شیخ نظام الدین اولیا "فوائد الفواد" ص ۶۵، ۱۹۵، ۹۷۔ (۸) سرکار، اورنگ زیب (۱۶۱۸ء تا ۱۷۰۲ء) ص ۱۰۱ (۹) مآثر عالمگیری ص ۱۰۰، ۱۱۱-۱۰) شری رام شرما "مغل شاسکوں کی دھارمک نیتی ص ۱۲۲، مآثر عالمگیری ۱۶۲۔ (۱۲) عالمگیری نامہ II ۲۹۲، ۴۲۲، ۴۳۸ (۱۳) وہ علاقہ جہاں کی آمدنی براہ راست شاہی خزانہ میں جمع ہوتی تھی۔ (۱۴) مرآۃ I ص ۲۴۹ (۱۵) دی انڈین ٹریولس آف تھیوینو اینڈ کاکیری، ایڈیٹر۔ ایس، این۔ سین نئی دہلی ۱۹۴۰ء ص ۳-۴ (۱۶) خافی خان، منتخب اللباب II ص ۸۸-۹ (ببلیو تھکا انڈیکا سیریز) (۱۷) مرآۃ I ص ۲۸۸ - ۹۱ (۱۸) ہری شنکر شریواستو۔ ایضاً ص ۱۳۱ (۱۹) ۱۷۱۳ء میں فرخ سیر نے اپنی حکومت میں پہلے سال ہی جزیہ معاف کر دیا۔ ۱۷۱۷ء میں جزیہ دوبارہ لگایا گیا اور ۱۷۱۹ء میں اُسے ختم کر دیا گیا۔ ۱۷۲۳ء اور ۱۷۲۵ء میں پھر جزیہ عائد کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس کے بعد جزیہ عائد کرنے کی تفصیل نہیں ملتی۔ (۲۰-۲۱) موازنہ ستیش چندر، سترہویں صدی کے دوران بھارت میں جزیہ اور راجیہ، ایضاً ص ۷۳۔ (۲۲) انگلش فیکٹریز (ایڈیٹر) فاسٹر، ۱۶۷۸ء ۱۶۸۴ء ص XXIX ۲۹ (۲۳) ہسٹری آف اورنگ زیب حصہ سوم ص ۲۷۰ (۲۴) دی اگیریرین سسٹم آف مغل انڈیا ص ۱۲۰ فٹ نوٹ ۵ (۲۵) ایم فاروقی "اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمس" ص ۱۵۸-۶۱ (۲۶) اگیریرین سسٹم ص ۲۹۸-۳۱۶ (۲۷) "مغل شاسکوں کی دھارمک نیتی" ص ۱۹۰-۹۱

باب - ۵

(۱) ولیم اروِن "لیٹر مغلس (۲) سرکار" فال آف دی مغل ایمپائر" حصہ ۴۔ (۳) سرکار "ہسٹری آف اورنگ زیب" حصہ ۳۔ کلکتہ ۱۹۱۶ء ص ۲۸۳، ۲۶۴ (۴) ستیش چندر "پارٹیز اینڈ پالیٹکس ایٹ دی مغل کورٹ ۱۷۰۷ء-۱۷۴۰ء علی گڑھ ۱۹۶۳ء (۵) عرفان حبیب، اگیریرین سسٹم آف مغل انڈیا ۱۵۵۶ء-۱۷۰۷ء بمبئی ۱۹۶۳ء (۶-۷) ایم اطہر علی "مغل سامراج کا انت" مدھیہ کالین بھارت، مدیر عرفان حبیب شمارہ ۱، ۱۹۸۲ء ص ۱۰۹-۱۰ (۸) آزاد بلگرامی "خزانہ عامرہ" کانپور ص ۴۷۔ (۹) محب الحسن "ہسٹری آف ٹیپو سلطان"

کلکتہ ۱۹۵۱ء ص ۴۴۴-۴۴۳ (۱۰) جنوری ۱۹۸۶ء کے آخری ہفتہ میں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں منعقد ایک نشست میں انھوں نے یہ خیال پیش کیا۔

باب - ۶

۱- انگریزوں نے ہندوستان میں کامیاب حکومت کرنے کے لیے فرقہ واریت کو اپنا مخصوص ہتھیار بنایا اور اسے استعمال کرنے کے لیے تاریخ کو وسیلہ بنایا۔ انگریز چلے گئے لیکن ان کی لکھی ہوئی تاریخ کو یہ دھیان دیے بغیر کہ تاریخ وہ ماضی ہے جس کے دریچے حال میں کھلتے ہیں اور موجودہ زمانہ کے بیشتر معاملات کا اس پر انحصار ہوتا ہے، ہمارے تعلیمی نصاب میں شامل کر دیا گیا۔ آج بھی فرقہ واریت کے مسئلہ (ملاحظہ ہو:۔ عرفان حبیب "اتیہاس اور سامپردایکتا" "رویوار" رشک انک، کلکتہ ۳۰ اگست - ۵ ستمبر ۱۹۸۷ء ص ۱۶ - ۲۰) کی اصل بنیاد اور ذرائع کو تاریخ کی کتابوں میں ہی تلاش کرنا ہوگا۔ انگریزوں ہی کی مہربانی ہے کہ ہندوستان میں دو قومی نظریہ وجود میں آیا۔ دو قومی نظریہ کا وجود میں آنا اس صورت میں تو ممکن ہوتا کہ مسلمانوں کی بڑی آبادی اس یقین میں مبتلا ہو جاتی کہ بحیثیت مسلمان انھوں نے صدیوں تک اس ملک پر حکومت کی ہے اور ہندوؤں کے ساتھ ایک شہری کی صورت رہنا بسنا ان کے نزدیک ممکن نہیں ہے۔ اس قسم کے انداز فکر کو مختلف مورخین نے وسطی عہد کا ہندوستان اور "مسلم نظام حکومت" پر نکتہ چینی کر کے استحکام بخشا۔ گذشتہ سال ہندوستان کی آزادی کے مجاہدوں کی یاد مناتے ہوئے ایک ٹیلی ویژن پروگرام میں رانا پرتاپ شیواجی اور گرو گووند سنگھ صرف تین مجاہدوں کے سلسلہ میں ہی قصیدہ خوانی کی گئی۔ ان میں سے کوئی بھی صحیح معنی میں ہندوستان کی آزادی کے لیے نہیں لڑا، طاقت میں اپنا حصہ بانٹنے کیلئے (جواہر لال نہرو، وشو اتیہاس کی جھلک ساتویں اشاعت، نئی دھلی ۱۹۸۶ء ص ۴۳۱ - ۴۳۹) یہ آپس میں لڑتے رہے۔

انگریزی عہد کی دین فرقہ واریت کے خطرہ کو سمجھنا ضروری بھی نہیں سمجھا گیا۔ ابتدائی مرحلہ میں فرقہ واریت پر شائع ہونے والے مواد پر گاندھی ازم یا نہرو ازم کی چھاپ ہوتی تھی۔ نہرو نے کہا: "فرقہ واریت قومیت کے لبادہ میں خود کو چھپا لیتی ہے اور فاشزم کا ہندوستانی آلۂ کار ہے۔ بڑھتے ہوئے فرقہ واریت کے (کیول شرما، "اب چاہیئے نئی دھرم نرپیکشتا" رویوار" وہی صفحہ ۱۸) خطرہ کو محسوس نہیں کیا گیا۔ ہم لوگ نہرو جیسے رہنماؤں کے خیالات سے متاثر تھے جو یہ تسلیم کرتے تھے کہ تقسیم کے بعد مسلم فرقہ پرست پاکستان چلے گئے اور ہندوستان میں مسلم فرقہ واریت اتنی کمزور ہے کہ وہ سر نہیں اٹھا سکتی۔ نہرو کا خیال تھا کہ ہندوستان میں جس فرقہ واریت کا ہمیں مقابلہ کرنا ہے وہ ہندو اور سکھ فرقہ واریت ہے۔ ۱۵۹۸ء میں اکبر نے متھرا اور اس کے نواح کے مندروں

کاایک سروے کرایا تھا اوران کے لیۓ زمین دی تھی ان میں سے کئی مندر (بقول عرفان مطابق محولہ بالا) آج بھی وہاں موجود ہیں۔ ان کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ اورنگ زیب نے انھیں محفوظ رکھا۔ اورنگ زیب کے بارے میں نہرو کے اس خیال کو کہ "اس نے ہندوؤں کو ستانے اور تنگ کرنے کے طریقے اختیار کیے۔ ہزاروں مندروں کو مسمار (جواہر لال نہرو ایضاً ص ۲۳۹۔ ۴) کرا ڈالا اور مغل سلطنت کا خاتمہ بھی اسی کے باعث ہوا" ہم کیا کہیں گے ؟

تاریخ محض حکمرانوں، مذاہب یا دوسری تحریکوں کی دستاویز نہیں بلکہ انسانی زندگی سے متعلق حالات اور معاملات کے صحیح ریکارڈ کا نام تاریخ ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے کام کا کیا طریقہ تھا جو کچھ وہ پیدا کرتے آیا اس کا فائدہ بھی انھیں حاصل ہوتا یا نہیں۔ ان کا معیار زندگی کس قسم کا تھا، کس طرح وہ درجوں اور طبقوں میں منقسم تھے، کل آبادی کا نصف حصہ عورتوں پر مشتمل تھا تو کیسی ان کی حالت تھی۔ کس طرح ان تمام لوگوں نے جنگل کو ہموار زمین کی صورت میں تبدیل کیا، گذشتہ کے مقابلہ ارتقاء نظر آتا ہے یا نہیں۔ ماضی کی تہذیبی عظمت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان تمام دستیاب چیزوں کو مثبت طریقہ سے کام میں لینے کی ضرورت ہے۔ نامکمل تاریخ تاریخ نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے تو غلط تاریخ سے زیادہ خطرناک۔ آدھا سچ جھوٹ سے زیادہ بُرا ہوتا ہے!

(۲) بی۔ این۔ پانڈے، "اسلام اینڈ انڈین کلچر" ۱۹۸۵ء ص ۵۔ ۳۳

(۳) راجندر پرشاد "انڈیا ڈوائڈیڈ" دہلی ۱۹۸۶ء ص ۶۔ ۲۵ (۴) ایضاً ص ۲۷۔ (۵) ایضاً (۶) ایضاً

(۷) سرکار، اورنگ زیب کے آپاکھیان" ص ۷۔ ۴۰

